شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
کی تحریک ریشمی رومال کے سو سال مکمل ہونے پر

ہفت روزہ
الجمعیۃ
نئی دہلی

کی

خصوصی اشاعت

تحریک ریشمی رومال نمبر

۱۵/ دسمبر ۲۰۱۳ء — ۱۰/ صفر ۱۴۳۵ھ

ترتیب و پیشکش
محمد سالم جامعی
خادم ادارۂ تحریر ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی

شائع کردہ
ہفت روزہ **الجمعیۃ** مدنی ہال، ۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی-۲
قیمت:- 100/ روپے

فہرست مضامین

افتتاحیہ

محمد سالم جامعی

تحریک ریشمی رومال نمبر

یہ ایک سچائی ہے کہ جو قوم اپنی تاریخ بھلا دیتی ہے اس کا وجود آہستہ آہستہ ختم ہوجاتا ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تاریخ بھی اسی المیہ سے دوچار ہے۔ مسلمانوں نے ہندستان کو اپنے آٹھ سو سالہ دورِ اقتدار میں کیا دیا اس کو تو چھوڑ دیجیے اس کے بارے میں تو آج ہماری نوجوان نسل کو ہی خود کوئی دلچسپی نہیں ہے، انھیں اگر کچھ معلوم ہے تو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ جتنا انھیں متعصب مغربی مورخین اور اپنے ملک کے فرقہ پرست مصنّفین نے اپنی کتابوں کے ذریعہ بتادیا ہے اور جس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمان غاصب کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ہندستانی عوام کی سادہ لوحی اور ان کے اختلافات کا فائدہ اُٹھا کر اس کے حکمراں بن بیٹھے۔ یہ ہی سوچ تھی جس نے ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے سقوط اور انگریزی سامراج کے اقتدار پر نہ صرف ملک کے اکثریتی عوام کو خاموش تماشائی بنائے رکھا بلکہ ایک طرح سے ان کے دلوں میں انگریزی سامراج کے تعلق سے ہمدردی و خیرخواہی کے جذبات بھی پیدا کردیئے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا جس کے اوّلین شاگرد رشید کا اسم گرامی محمود حسن دیوبندی تھا۔ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ سے جو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں نمایاں کردار و مقام کے حامل تھے، آپ کو شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ آپ ہی مولانا نانوتویؒ کے علوم و افکار کے امین ثابت ہوئے خاص طور پر جہادِ حریت کی جو شمع آپ کے محترم استاذ نے روشن کی تھی آپ نے اس شمع کی روشنی کو نہ صرف اندرونِ ملک پھیلا دیا بلکہ اس روشنی کو آپ بیرونِ ملک تک لے گئے اور اس طرح حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے جنونِ حریت نے ملک کو دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ایک بامقصد تحریک عطا کردی جس کے نتیجے میں ۱۸۶۶ء میں قائم ہونے والا یہ ایک چھوٹا سا مدرسۂ عربی کچھ ہی عرصہ میں ایک بڑا ادارالعلوم بن گیا اور پھر یہ ادارہ صرف تعلیم اور کتاب وسنت کے مرکز تک محدود نہ رہ کر تحریک آزادی کا ایک بڑا مرکز بھی بن گیا جہاں تعلیم و تعلّم کے ساتھ آزادی کے متوالوں کی تربیت اور ذہن سازی کا فریضہ بھی انجام پانے لگا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ بھی اسی دارالعلوم کے تربیت یافتہ تھے جس کی وجہ سے آپ کے سینہ میں وطن کی آزادی کا جذبہ موجزن تھا۔ اسی جذبۂ حریت نے جو آپ کے اساتذہ کی نظر خاص کا مرہونِ منّت تھا اس منظّم اور باضابطہ تحریک کی بنیاد ڈالی جسے تحریک ریشمی رومال کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد انگریزی سامراج کے خلاف ایک ایسی جدوجہد کا آغاز تھا جس کے ذریعہ اندرونِ ملک بغاوت کے ساتھ بیرونِ ملک سے حملہ کی تیاری کرنا تھا، اس کے

لیے حضرت شیخ الہندؒ نے انتہائی خاموشی اور رازداری کے ساتھ ملک کے مختلف علاقوں میں مراکز قائم کیے۔ان مراکز پر پیغام رسانی کا پروگرام طے کیا گیا جس کے لیے ریشمی رومال کا انتخاب ہوا۔ ریشمی رومال تحریک کے کمانڈر انچیف حضرت شیخ الہندؒ کی طرف سے پیغام تیار کرنے کا کام حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سپرد تھا۔اس تحریک کے نتیجہ میں مجاہدین اندرونِ ملک بغاوت پر کمربستہ تھے مگر چونکہ بیرونی حملے کے بغیر کامیابی کا امکان نہیں تھا اس لیے پہلے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو افغانستان، ترکی اور جرمنی بھیجا گیا۔انھوں نے ان ملکوں میں ماحول سازی کی، پھر بیرونی امداد کو یقینی بنانے کے لیے خود حضرت شیخ الہندؒ انتہائی رازداری اور احتیاط کے ساتھ حجاز کے لیے روانہ ہوئے جہاں آپ نے ترکی گورنر سے ملاقات کر کے انھیں اپنے منصوبوں سے آگاہ کیا اور ان سے تعاون کی درخواست کی۔ تحریک کی رازداری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ جو اس وقت مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے اور مسجد نبوی میں درسِ حدیث کی خدمت انجام دے رہے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد شاگرد ہونے کے باوجود ان سرگرمیوں سے بے خبر تھے، مگر افسوس کہ یہ راز افشا ہو گیا اور پنجاب کے گورنر مائیکل ایڈوائر کے ہاتھ وہ تین خطوط پڑ گئے جو مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنے قیامِ افغانستان کے دوران حضرت شیخ الہندؒ کو اپنی سرگرمیوں کے متعلق بھیجے تھے۔ یہ تینوں خطوط ایک زرد ریشمی کپڑے پر تحریر تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ اس دوران حجاز کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور چونکہ اس وقت حجاز پر ترکی کی حکمرانی تھی اس لیے انگریزی سامراج حضرت شیخ الہندؒ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، مگر اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ ایک طرف ہندستان میں مولانا سندھیؒ کے بھیجے ہوئے خطوط پکڑے گئے اور دوسری طرف شریف مکہ کی بغاوت کے نتیجہ میں حجاز سے ترکی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر کیا تھا حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء گرفتار کر لیے گئے اور اس طرح انگریزی سامراج ریشمی رومال تحریک کی دھار کند کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ تحریک جس نے انگریزی اقتدار کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں بے اثر ہو کر رہ گئی۔ اس طرح ریشمی رومال تحریک ہندستان کی تحریک آزادی کا ایک ایسا باب ہے جس سے پورے ہندستان کی تاریخ روشن ہے۔ یہ ہی وہ تحریک تھی جس نے ہندستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک آزادی کی شمع روشن کر دی تھی اور جس نے غلامی کے اندھیروں کو روشنی میں بدلنے کا آغاز کیا تھا۔

یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہماری آج کی نسل ریشمی رومال تحریک تو کیا اس بات سے بھی واقف نہیں ہے کہ اس ملک کو آزاد کرانے میں ہمارے آبا و اجداد کا کیا رول تھا اور انھوں نے اس کے لیے کیا قربانیاں دی تھیں۔ ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کا آغاز مسلمانوں کے ذریعہ ہی عمل میں آیا تھا جس کی قیادت علمائے کرام کے ہاتھوں میں تھی۔ تحریک آزادی کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور علماء نے فتویٰ جاری کر دیا کہ ملک کو انگریزی سامراج سے چھٹکارا دلانا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے جس سے تحریک پا کر نہ معلوم کتنے مسلمانوں نے ہندستان کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ یہ مسلمان ہی تھے جن کے جذبۂ آزادی سے تحریک پا کر دوسرے برادرانِ وطن نے تحریک آزادی

میں شرکت کی۔ ۱۸۵۷ء کے دوران بڑی تعداد میں مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ان کی جائیدادیں ضبط کر کے نہ معلوم کتنے لوگوں کوعبور دریا شور کی سزا دی گئی اور نہ معلوم کتنے مسلمانوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔اس دور کے تاریخ نویسوں نے مسلمانوں کی قربانیوں کے بارے میں جولکھا ہے وہ اس پر شاہد عدل کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس بد دیانتی کا کیا کیا جائے کہ آج مسلمانوں کی اس تاریخ کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بھلایا جارہا ہے اور تاریخ کو مسخ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کا کوئی رول نہیں ہے۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد کے نتیجہ میں سرکاری حلقوں میں تحریک آزادی میں مسلمانوں کے رول کی اہمیت کا اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ابھی گزشتہ سال ۲۰۱۲ء میں وزارتِ مواصلات کی طرف سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی تحریک آزادی میں عظیم خدمات کے اعتراف میں ان پر ڈاک ٹکٹ کا اجراء عمل میں آیا تھا اور اس سال ۱۱؍جنوری ۲۰۱۳ء کو ملک کو آزادی کی روشنی عطا کرنے والی ریشمی رومال تحریک کی یاد میں حکومت نے ڈاک ٹکٹ جاری کیا ہے۔جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام نئی دہلی کے معروف وگیان بھون میں ریشمی رومال تحریک کے جشن صد سالہ کے موقع پر صدرِ جمہوریہ ہند مسٹر پرنب مکھرجی کے ہاتھوں یہ ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔

ریشمی رومال تحریک کا آغاز حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۳ء میں فرمایا تھا۔یہی وہ تحریک تھی جس کے ذریعہ ملک کی آزادی کے لیے ایک ایسی شمع جلائی گئی تھی جس کی روشنی میں سفر کرتے ہوئے ہندستان کو آزادی کی دولت میسر آئی۔حضرت شیخ الہندؒ اس تحریک کے روحِ رواں تھے جنھوں نے اس کی پاداش میں مسلسل تین سالوں تک مالٹا میں سخت قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، پھر جیل سے رہائی کے بعد ہندستان واپس آکر بھی انتہائی بیماری،ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود آپ کا یہ مشن جاری رہا۔آپ نے اسی حال میں دیوبند سے علی گڑھ کا سفر کیا اور وہاں تحریک ترک موالات کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی جو آج نئی دہلی کے اوکھلا میں ایک اقلیتی یونیورسٹی کی شکل میں مسلم نوجوانوں کو زیورِ علم سے آراستہ کر رہی ہے۔

زیر نظر ہفت روزہ 'الجمعیۃ' کی یہ خصوصی اشاعت 'تحریک ریشمی رومال نمبر' آپ کے سامنے ہے جس میں تحریک ریشمی رومال، اس کے بانی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہٗ، تحریک ریشمی رومال کے جانباز سپاہی حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور تحریک کی پاداش میں قید و بند کی زندگی گزارنے والے شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا عزیر گلؒ، حضرت مولانا وحید احمد صاحبؒ اور حکیم نصرت حسینؒ کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ہم اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں یہ فیصلہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑ رہے ہیں تاہم ہمیں اعتراف ہے کہ وقت کی تنگی اور کاموں کے ہجوم کی وجہ سے ہم اس اشاعت کو اس کی شایانِ شان نہیں بنا سکے ہیں جس کے لیے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے اور ملت کے لیے نفع بخش بنائے،آمین۔ □□

ہندستان دارالحرب ہے لہٰذا ہر محبّ وطن کا فرض ہے کہ

اجنبی طاقت کے خلاف اعلانِ جنگ کردے

۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ جہاد

اٹھارہویں صدی کی شام کو جب ہندستانی عظمت کا آفتاب غروب ہورہا تھا اس وقت غلامی کی شب تاریک تیزی سے پورے ملک پر چھارہی تھی اور انگریز اقتدار کی صبح صادق نمودار ہورہی تھی۔

اب آزادیٔ وطن کی سونی بزم میں صرف مرہٹی اقتدار کی ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع باقی تھی۔ لال قلعہ میں جو کچھ اُجالا تھا وہ اسی کا عکس تھا۔ ایک چراغ شمال مغربی علاقہ میں بھیگ رہا تھا۔ یہ راجہ رنجیت سنگھ کا چراغ تھا۔ مسلمانوں کی تمام قابلِ ذکر طاقتیں ختم ہوچکی تھیں۔ جو ختم نہیں ہوئی تھیں وہ مفلوج ہوکر انگریزی اقتدار کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔ ۱۸۰۰ء کے آخر میں لارڈ لیک، انگریزی فوجوں کو لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ سندھیا کی فوجیں شاہی اقتدار کی محافظ تھیں۔ وہ سینہ سپر ہوئیں، مگر انگریز کی فوجی طاقت مرہٹوں کی قوت اشارے سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ مجبوراً شکست خوردہ دہلی نے انگریزوں کا استقبال کیا۔ لارڈ لیک نے دہلی پر تسلط کرکے شاہ عالم سے ایک نیا معاہدہ کیا۔ سندھیا پیچھے ہٹا تو ہلکر اور امیر علی خاں آگے بڑھے، مگر دہلی کے محاذ پر ان کو بھی شکست ہوئی تو سکھوں کی بہادری کا صدقہ لینے کے لیے پنجاب پہنچے۔ ان کو یہاں کچھ مالی امداد تو مل سکی مگر فوجی امداد کے لیے کوئی سردار تیار نہیں ہوا۔ بڑی امید مہاراجہ رنجیت سنگھ سے تھی، اس نے بھی صاف انکار کردیا۔

اب مجبوراً ان کو انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور ۱۸۰۶ء میں لارڈ لیک سے ایک معاہدہ کرکے اپنے ملک واپس ہوئے، مگر انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کی جو آگ ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی وہ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ پورے ہندستان میں کوئی نہیں تھا جو ان کی ہمنوائی کرتا۔ صرف ایک راجہ اور ایک فقیر ان کا ہمنوا تھا۔ راجہ مادھو جی سندھیا اور فقیر شاہ عبدالعزیز۔ ہلکر اور سندھیا کی باہمی رقابت و عداوت تاریخ کا مشہور افسانہ ہے۔ اس رقابت نے ان کو الگ الگ کررکھا تھا لیکن انگریزوں کی مخالفت ایک مشترک مقصد تھی جس نے ان تینوں امیر علی خاں، ہلکر اور سندھیا کو متحد کردیا تھا۔

۱۷۵۶ء میں جب پٹنہ اور بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ (اودھ) اور شاہ عالم کو شکست ہوچکی تھی تو فوراً ہی دہلی پر قبضہ کرلینا بھی مشکل نہیں تھا کیونکہ انگریزوں کی فوجی طاقت اتنی ترقی کرچکی تھی کہ وہ آسانی سے یہ پروگرام کامیاب کرسکتے تھے۔ مگر انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ مرنے والوں کو اپنی موت مرنے دیا جائے، اس کو گولی کا نشانہ بناکر بلاضرورت کارتوس خراب نہ کیا جائے۔ چنانچہ انگریز مدبرین وہ زہریلے نسخے تو استعمال کرتے رہے جو مرض کو مہلک بناکر موت کو یقینی بنادیں، مگر اس کے روادار نہیں ہوئے کہ فوجی قوت کے ذریعہ ایک سال بعد مرنے والوں کو آج ہی ختم کردیں۔ ان کے تجارتی مقاصد کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ زراندوزی اور ملک گیری کے وہ راستے نہ اختیار کریں جن سے عوام میں بددلی پیدا ہو۔ جب ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کیا تو یہاں بھی اس سوچی سمجھی اور طے شدہ پالیسی سے کام لیا گیا۔ یعنی بادشاہ کو معزول کرنے اور شاہی تخت و تاج چھیننے کے بجائے بادشاہت کا وہ

نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو انگلستان کی آزاد پارلیمنٹ خود اپنے بادشاہ کے لیے طے کر چکی تھی اور جس پر خود انگریزوں کے وطن میں سالہا سال سے عمل ہو رہا تھا۔ یعنی بادشاہ کو تاج وتخت کے ساتھ باقی رکھتے ہوئے صرف اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے تسلیم کرا لیے گئے اور اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔''

غور فرمایئے کہ کس قدر نازک پوزیشن ہے۔ خدا کی خدائی اور اس کی قدرتِ کاملہ تسلیم کر کے مذہب کا دامن بھی دونوں ہاتھوں سے تھام لیا گیا۔ مغل بادشاہ کی بادشاہت اور آل تیمور کی عظمت بھی محفوظ کر دی گئی۔ صرف کاروبارِ حکومت جو ہندو یا مسلمان، امراء اور وزراء کے حوالہ ہوا کرتا تھا، اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔۔ تہذیب اور کلچر کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے بلکہ ہندوؤں کے سماجی معاملات پنڈتوں کے اور مسلمانوں کے معاشرتی قاضیوں کے سپرد کر کے ان کو کلچرل اٹانمی (تہذیبی خودمختاری) بھی دے دی گئی ہے۔ عوام تو عوام اس زمانہ کے خواص بھی اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے تھے جو سابق امراء اور وزراء کے اختیارات یا انگلستان کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے درمیان تھا۔ ان کی نظر مذہب، تہذیب اور بادشاہ پر تھی۔ یہ سب محفوظ تھے۔ لہٰذا ایک نہایت ہی نازک سوال تھا کہ موجودہ حالت کو آزادی کہا جائے یا غلامی۔ اسلامی قوانین کی رو سے پیچیدہ سوال یہ ہے کہ اب ہندستان کو دارالاسلام مانا جائے جیسا کہ پہلے تھا یا دارالحرب کہا جائے۔ جہاں برسرِاقتدار طاقت سے جنگ کرنا یا اس ملک سے نکل جانا مذہباً فرض ہے، یا اس کو دارالامن مانا جائے جہاں اگرچہ حکومت غیر مسلم ہے مگر مسلمانوں کی جان و مال محفوظ ہے اور مذہبی آزادی ان کو حاصل ہے اور اس بنا پر حکومت سے جنگ کرنا درست نہیں ہے۔

بہرحال ایک نہایت ہی پیچیدہ سوال تھا جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی سیاسی مفکرین اور علمائے کرام کے سامنے آیا۔ اس سوال کے جواب میں اختلافِ رائے ہوسکتا تھا اور انگریز جیسی شاطر اور ڈپلومیٹک قوم کے لیے نہایت آسان تھا کہ اس اختلاف سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں کو گمراہ کرلے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور کامیاب ہوئی۔ مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (قدس اللہ سرہٗ العزیز) کی سیاسی درس گاہ کے تربیت یافتہ پختہ کار ایسے شعبدوں سے مسحور ہونے والے نہیں تھے۔ چنانچہ اس پارٹی کے رہنما سیّدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ نے فارسی زبان میں ایک فتویٰ صادر فرمایا جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے:

''یہاں عیسائی افسران کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے اور ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظامات رعیت، خراج، باج، عشر و مال گزاری، اموالِ تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات، مقدمات کا تصفیہ، جرائم کی سزاؤں وغیرہ (یعنی سول، فوج، پولیس، دیوانی اور فوجداری معاملات، کسٹم اور ڈیوٹی وغیرہ) میں یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختارِ مطلق ہیں۔ ہندستانیوں کو ان کے بارے میں کوئی دخل نہیں۔ بے شک نمازِ جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤں جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے (یعنی ضمیر اور رائے کی آزادی اور شہری آزادی) وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ عوام کی شہری آزادی ختم ہوچکی ہے۔ انتہا یہ کہ کوئی مسلمان یا ہندو ان کے پاسپورٹ اور پرمٹ کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف وجوانب میں نہیں آسکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہوسکتے۔ دہلی سے کلکتہ تک انھیں کی عمل داری ہے۔ بیشک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ، رام پور میں چونکہ وہاں کے فرماں رواؤں نے اطاعت قبول کرلی ہے براہِ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔''

(مگراس سے پورے ملک کے دارالحرب ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا) (فتاویٰ عزیزی فارسی، جلداوّل،ص ۱۷،مطبوعہ مطبع مجتبائی)

ایک دوسرے فتویٰ میں بھی مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ہندستان کا دارالحرب ہونا ثابت کیا ہے۔ (جلد اوّل،ص ۱۰۵،فتاویٰ عزیزی افارسی،مطبوعہ مطبع مجتبائی)

فتویٰ کی زبان مذہبی ہے کہ ’دارالحرب‘ کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر روح سیاسی ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ:

۱- قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

۲- مذہب کا احترام ختم ہے۔

۳- اورشہری آزادی سلب کرلی گئی ہے۔

لہٰذا ہر محبِّ وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلانِ جنگ کردے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کردے، اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔

اس موقع پر یہ حقیقت نظرانداز نہ ہونی چاہیے کہ نجف علی خاں کی وفات (۱۷۸۲ء) کے بعد تقریباً بیس سال سے اقتدار مرہٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ مرہٹوں کا پیشوا (مادھونرائن پھر باجی راؤ) امیر الامراء تھا اور مادھوجی سندھیا نائب امیر الامرا اور جس طرح آج یہ اعلان ہورہا تھا کہ ’’حکم کمپنی بہادر کا‘‘ بیس سال پہلے سے دُنیا دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ حکم تھا وہ پیشوا یا سندھیا کا تھا یعنی پایۂ تخت اور اس کے گردونواح میں ایک غیر مسلم طاقت یعنی مرہٹوں کا تسلط تھا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب اوران کی پوری پارٹی دہلی میں موجود تھی، ان کے سامنے یہ سب کچھ ہورہا تھا۔ ان کے منہ میں زبان تھی اور ہاتھ میں قلم تھا۔ چنانچہ جن باتوں میں وہ مرہٹوں کے نظامِ حکومت سے ناراض تھے ان پر سخت سے سخت تنقید کی تھی۔ آج بھی وہ عربی اور فارسی کے اشعار سب موجود ہیں جن میں مرہٹوں پر گہری تنقید ہے، لیکن بایں ہمہ ان بیس سالوں میں نہ وطن عزیز کو دارالحرب قرار دیا اور نہ ہندستانیوں کے لیے ’’آزادی اور نہ ترکِ وطن‘‘ کا فتویٰ صادر کیا، بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کا جنگجو طبقہ جو شاہ عبدالعزیز صاحب سے گہری عقیدت رکھتا تھا یعنی روہیلہ پٹھان، ان کے تعلقات مرہٹوں سے اور زیادہ مضبوط ہوگئے۔ یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو اذیتیں پہنچانے کی جو روایتیں نقل کی جاتی ہیں ان میں جس کا نام لیا جاتا ہے وہ نجف علی خاں ہے، جو انگریزوں کا پرانا وظیفہ خوار اور ان کا لایا ہوا وزیر تھا۔

فتوے کا اثر:

عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے حیرت میں رہ گئے تھے اور اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ مذہب کی روشنی میں فیصلہ کرسکیں کہ اس اقتدار کے مقابلہ میں ان کا طرزِ عمل کیا ہو، ان کے لیے اب راستہ کھل گیا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ باہمت جنگجو طبقہ جابجا اس طاقت سے وابستہ ہوگیا جو اس وقت انگریزوں کے برسرپیکار تھی۔ یہ طاقت اس وقت ضرور مرہٹوں کی تھی۔

چنانچہ اس دور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہوگئی اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ مرہٹی علاقوں کے مسلمان مرہٹوں کی فوج میں شامل ہوکر آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے بلکہ شمالی ہند کے بھی بہت سے مسلمان ان علاقوں میں پہنچے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں شریک ہوگئے۔ خود حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمد صاحب کو امیر علی خاں سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت پر شب خون مار رہے تھے۔

یہی وہ عظیم فتویٰ ہے جس کے اثرات حضرت شیخ الہندؒ کی جدوجہد آزادی میں صاف اور نمایاں نظر آرہے ہیں۔ ❑❑

تحریک شیخ الہند سے روشناس کرانے کی ضرورت

خطبۂ صدارت اکتیسواں اجلاس عام جمعیۃ علماء ہند کا اقتباس

ہمدردان ملک وقوم! آپ کو یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ تاریخ اور مؤقر اکابر واسلاف کے روشن کارنامے حال کو بنانے اور مستقبل کی نقشہ گری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ اور اپنے اکابر کے نقوش حیات وخدمات کو گم کردیں گے تو ہم خود حالات وزمانے کے جنگل میں کھو جائیں گے۔ نئی نسل کی کامیابی میں بزرگوں کے کارناموں کی رہ نمائی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ایسے ہی اکابر واسلاف میں سے ہیں، جنھوں نے جرأت ورہ نمائی اور ظلم وجبر کے خلاف جدوجہد میں ایسے بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں، جن سے ملک وقوم کو توقیر وبلندی ملتی ہے۔ تحریک آزادی ہند کے حوالے سے تحریک شیخ الہند ایک ایسا عنوان ہے، جس کے تحت آزادی اور برٹش سامراج کے خلاف جدوجہد کے روشن ابواب آتے ہیں۔ ۱۹ویں صدی اور بیسویں صدی کی دو دہائی تک اگر غور سے دیکھا جائے، حضرت شیخ الہند دیوبندیؒ کی شخصیت اور فکر چھائی نظر آتی ہے۔ اس دور کی بیشتر عظیم شخصیات چاہے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہوں، یا مولانا محمد علی جوہر، یا گاندھی جی، مولانا حسرت موہانی، یا دیگر سماجی، سیاسی، مذہبی شخصیات سب کے لیے حضرت شیخ الہندؒ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ مولانا عزیر گل، جیسے اعاظم رجال تو ان کے تلامذہ ہی تھے اور ان میں ہر ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا وتلامذہ نے ان کی رہ نمائی وقیادت میں ملک وقوم کی خدمت، تحریک آزادی اور برٹش سامراج کو ملک سے نکال باہر کرنے کی جو عظیم جدوجہد کی ہے، وہ تحریک آزادیِ ہند کی تاریخ کا سنہری باب ہے۔ اس کے تذکرے کے بغیر آزادی ہند کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے کہ تحریک آزادی کی تاریخ نگاری میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا اور تحریک شیخ الہندؒ کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس بے توجہی اور بے اعتنائی ونافرض شناسی کا غلط نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ ہماری نئی نسل کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کون تھے۔ اور ان کی تحریک نے ملک وملت کے وقار ومعیار کو بلند کرنے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اگر ہماری نسل کو اپنی تاریخی بنیاد سے محروم کر دیا جائے، تو وہ فکر وعمل کی عمارت کی تعمیر کیسے کر پائے گی۔ اب تو یہ حال ہوتا جا رہا ہے کہ بڑے اور پرانی نسل کے لوگ بھی اپنی تاریخ اور بزرگوں کے کارنامے کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ دراز ہوگا تو ہم تاریخ اور ماضی کی رہ نمائی سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ اس کے مدنظر شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ”نام نیکاں ضائع مکن“ کی آواز لگاتے ہوئے موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنے اکابر واسلاف کے کارناموں سے وابستگی کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ اس نیک مقصد کے پیش نظر سو سال پورے ہونے پر جمعیۃ علماء ہند نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی تحریک سے روشناس کرانے کی سمت میں قدم بڑھایا ہے اور طے کیا ہے کہ پورے ملک کے مرکزی مقامات پر پروگرام اور سیمینارز کیے جائیں۔ اس سے ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی راہ ہموار ہوگی کہ آبرومندانہ زندگی کی نیک خواہش اور اس کے لیے جدوجہد کی تاریخ ہمارے لیے راہ عمل کے تعین میں کسی حد تک رہ نمائی کرتی ہے۔ اور ماضی کے آئینے میں حال کی کیا تصویر ابھرتی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام احمد آباد گجرات سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ صوبائی، ضلعی اور مقامی جمعیتیں بھی حسب حالات وضرورت، حضرت شیخ الہند: اور ان کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کا اہتمام کریں اور ہر ممکن طریقے کو عمل میں لا کر تحریک شیخ الہندؒ سے ملک کو روشناس کرانے کی کوشش کریں۔ یہ حالات کا تقاضا بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔

اکتیسواں اجلاسِ عام منعقدہ ۱۸-۱۹؍مئی ۲۰۱۲ء، بمقام دہلی کی منظور کردہ

تحریک شیخ الہند سے متعلق تجویز

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام تحریک آزادی کے معمار، قافلہ حریت کے سپہ سالار اور جمعیۃ علماء ہند کے فکری رہنما حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی تحریک ریشمی رومال کے سو سال پورے ہونے کے موقع پر خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ان اکابر و اسلاف میں سے ہیں، جنھوں نے ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد میں ایسے بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں، جن سے ملک و قوم کو توقیر و سربلندی ملتی ہے۔ تحریک آزادی ہند کے حوالے سے تحریک شیخ الہند ایک ایسا عنوان ہے، جس کے تحت آزادی اور برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کے روشن ابواب آتے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا و تلامذہ نے ان کی رہ نمائی و قیادت میں ملک و قوم کی خدمت، تحریک آزادی اور برطانوی سامراج کو ملک سے نکال باہر کرنے میں جو عظیم قربانی دی ہے، وہ تحریک آزادیِ ہند کی تاریخ کا سنہری باب ہے۔ اس کے ذکر کے بغیر آزادی ہند کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ افسوس ناک بات ہے کہ تحریک آزادی کی تاریخ نگاری میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا اور تحریک شیخ الہندؒ کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس بے اعتنائی اور بزرگو ں کی قربانیوں سے عصبیت کی بنیاد پر صرف نظر کرنے کا یہ غلط نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ ہماری نئی نسل کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کون تھے اور ان کی تحریک نے ملک و ملت کے وقار و معیار کو بلند کرنے میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ اگر ہماری نسل کو اپنی تاریخی بنیادوں سے محروم کر دیا جائے، تو وہ فکر و عمل کی عمارت کی تعمیر کیسے کر پائے گی۔ اب تو یہ حال ہوتا جا رہا ہے کہ بڑے اور پرانی نسل کے لوگ بھی اپنی تاریخ اور بزرگوں کے کارنامے فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ دراز ہوگا تو ہم تاریخ اور ماضی کی رہ نمائی سے کٹ کے رہ جائیں گے۔ اس کے مدنظر یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ:

۱. آنے والی نسلوں کے لیے اپنے اکابر و اسلاف کے کارناموں سے وابستگی کا سامان بہم کیا جائے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی تحریک سے روشناس کرانے کی غرض سے ملک بھر میں مرکزی مقامات پر پروگرام اور سیمینار کیے جائیں۔ اس سے ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی راہ ہموار ہوگی کہ باعزت زندگی کی نیک خواہش اور اس کے لیے جدوجہد کی تاریخ راہ عمل کے تعین میں کس حد تک رہ نمائی کرتی ہے اور ماضی کے آئینے میں حال کی کیا تصویر ابھرتی ہے۔

۲. جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام احمد آباد گجرات سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ صوبائی، ضلعی اور مقامی جمعیتیں بھی حسب حال و ضرورت، حضرت شیخ الہند: اور ان کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کا اہتمام کریں اور ہر ممکن طریقے کو عمل میں لا کر تحریک شیخ الہندؒ سے ملک کو روشناس کرانے کی کوشش کریں۔

۳. حضرت شیخ الہند کے نام کسی یونیورسٹی کو منسوب کیا جائے

۴. نصاب کی کتابوں میں حضرت شیخ الہند کا تذکرہ شامل کیا جائے۔

گوشۂ تحریک شیخ الہندؒ

انقلابی تحریکات میں ایک تحریک وہ ہے جسے 'ریشمی رومال تحریک' کہا جاتا ہے۔ محکمہ خفیہ کے کار پردازوں کو ہمہ دانی کا بہت کچھ دعویٰ ہے۔ ممکن ہے کسی تحریک کے متعلق یہ دعویٰ درست ہو مگر جہاں تک اس تحریک کا تعلق ہے یہ دعویٰ سراسر غلط ہے۔ ایک خط جو ریشمی رومال پر لکھا گیا تھا۔ وہ سی. آئی. ڈی کے ہاتھ لگ گیا۔ یہی خط سی. آئی. ڈی کی تجسّس و تفتیش کی بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انھوں نے ایک عمارت کھڑی کی اور اس کا نام 'ریشمی خطوط والی تحریک' رکھ دیا۔ یہ بنیاد ہی بے بنیاد ہے تو جو عمارت اس پر کھڑی ہوگی وہ بھی سراسر ریگ کا تودہ ہوگی۔

سی. آئی. ڈی کی رپورٹوں کا ایک طومار ہے جو لندن کے 'انڈیا آفس' میں محفوظ تھا۔ انڈیا آفس سے وہ خارج (ریلریز) کیا گیا تو محترم مولانا موسیٰ بھائی کرماڈی اور اُن کے چند مخلص احباب نے اس کے 'فلم' لے لیے۔ یہ فلم 'جمعیۃ علماء ہند' کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان کا ترجمہ آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے ہے۔

یہ خط مولانا عبیداللہ سندھی کا لکھا ہوا تھا۔ سی. آئی. ڈی نے مولانا سندھی ہی کو اس تحریک کا بانی سمجھ لیا جو سراسر غلط ہے۔ اس خط کی بنیاد پر تحقیق و تفتیش کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ بہت سے حضرات شبہ میں گرفتار کئے گئے۔ عرصہ تک ان کو کسی مقام پر نظر بند رکھا گیا یا جیل میں ڈال دیا گیا۔ تو محکمہ نے یہ سمجھا کہ ہماری جدوجہد نے تحریک کو ختم کر دیا حالانکہ تحریک جس وقت شباب پر تھی سی. آئی. ڈی کو اس کی کسی پرچھائیں کا بھی پتہ نہیں چلا لیکن جب تحریک خود اپنے حالات کی بنا پر افسردہ ہوگئی اور کار پردازوں نے بھی راز داری کو غیر ضروری سمجھا تب سی. آئی. ڈی کو موقع ملا کہ وہ دعویٰ ہمہ دانی کا سہرا باندھ سکے۔ اور تحریک کی ناکامی کو اپنی جدوجہد کا نتیجہ قرار دے۔

بانی تحریک کون؟

سوال یہ ہے کہ بانی تحریک کے سلسلہ میں ان رپورٹ کرنے والوں کا بیان صحیح مانا جائے یا وہ بیان صحیح مانا جائے جو خود مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی ذاتی ڈائری میں تحریر فرمایا جس کے چند فقرے یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں۔

۱۳۲۷ھ-۱۹۰۹ء میں شیخ الہند رحمۃ اللہ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا۔ اور مفصل حالات سن کر دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا ۱۳۳۱ھ-۱۹۱۴ء میں نظارۃ المعارف' قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لائے۔ اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا۔

۱۳۳۳ھ-۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصّل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہ کرتی تھی۔ مگر تعمیلِ حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں بتا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے۔ اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر

منظّم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے۔ اس کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

(۱) اس بیان سے واضح ہوگیا کہ اس تحریک کے بانی مولانا عبیداللہ سندھیؒ نہیں تھے بلکہ (۱۹۱۵ء تاریخ روانگی مولانا سندھی سے) پچاس سال پہلے تقریباً ۱۸۶۵ء میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اور شیخ الہند رحمۃ اللہ ہندستان میں اس جماعت کے نمائندے تھے۔

(۲) ایک جماعت ہندستان میں بھی قائم ہوچکی تھی۔ اس کے ارکان مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں وغیرہ تھے رحمہم اللہ۔ یہ جماعت بھی مولانا سندھی کی جدو جہد سے نہیں۔ بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے قائم ہوئی تھی یا خود ارکانِ جماعت کے احساس اور اُن کے اتحادِ فکر نے اِس کی بنیاد ڈال دی تھی اور اب حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا سندھی کو اس میں شریک کرایا تھا۔

(۳) یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ مولانا سندھی کا دیوبند سے دہلی منتقل ہونا ذمہ دارانِ دارالعلوم کے کسی اختلاف کے باعث نہیں تھا۔ بلکہ جماعت کے پروگرام کے بموجب ان کا کام مرکز علوم دارالعلوم دیوبند سے دہلی منتقل کیا گیا تھا جو پورے ہندستان کا سیاسی مرکز تھا۔

(۴) مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۳۳ھ-۱۹۱۵ء میں کابل تشریف لے گئے وہاں آپ نے ایک جماعت دیکھی جو پچاس سال سے کام کررہی ہے۔ (یعنی ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ء سے) یہ وہ زمانہ ہے کہ علماء صادق پور کی جماعت کے امیر مولانا عبداللہ (خلف اکبر حضرت مولانا ولایت علی صاحب) (جونومبر ۱۹۰۲ھ شعبان ۱۳۲۰ھ تک امیر رہے) اور ہندستان میں اس جماعت کے افراد پر سازش کے مقدمات چل رہے تھے۔

(۵) لیکن مولانا سندھی رحمۃ اللہ نے جن سے رابطہ قائم کیا وہ اگرچہ اپنی اہمیت اور عظمت کے لحاظ سے جماعت تھے بلکہ اِن میں کا ہر ایک فرد جماعت تھا۔ مگر وہ کسی جماعت سے منسلک نہیں تھے۔

بیشک وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ اور ان کے شیخ ومرشد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی وحضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہما اللہ کے دامنوں سے وابستہ تھے۔ مگر ان کی خدمات اپنے اپنے حلقوں میں محدود تھیں کوئی جماعتی انسلاک نہیں تھا۔ یہی حضرات تھے جن کے متعلق مولانا سندھی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے 'غیر منظّم شکل' میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے۔ (علماء حق جلد ۱، ص ۱۳۱ ۲)

پوری تحریک پر اجمالی نظر:

سی.آئی.ڈی کی رپورٹ بلکہ محکمہ خفیہ کی پوری کارروائی آپ کے سامنے آگے آئے گی۔ مگر اس سے تحریک کا قابل اطمینان نقشہ آپ کے سامنے نہیں آسکے گا اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تحریک کا قابلِ اطمینان نقشہ آپ کے سامنے پیش کردیا جائے یہ نقشہ محترم غلام رسول صاحب مہر کا مرتب فرمودہ ہے۔ وہ اگرچہ تحریک کے رکن نہیں تھے مگر حضرت سیّد احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ کے دور سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے دور تک جس کی مدت سو سال سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس پوری تحریک اور اس کی شاخوں کے کارناموں اور ان کی سرگذشتوں کے حالات کے بہترین محقق اور ماہر ہیں۔ پہلے ان کا مرتب کیا ہوا نقشہ پیش کیا جارہا ہے اس کے بعد اس تحریک کے عظیم رکن شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ کی مرتب فرمودہ روداد پیش کی جائے گی۔ آپ یہ نقشہ اور روداد ملاحظہ فرمالیجیے۔ پھر آپ سی.آئی.ڈی کی رپورٹ پر علی وجہ البصیرت نظر ڈال سکیں گے۔

شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادی

تحریر: حضرت مولانا غلام رسول مہرؒ

میرے مطالعہ اور غور وفکر کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک نقشۂ عمل تیار کر چکے تھے۔ اور اسے لباس عمل پہنانے کی کوششیں انھوں نے اُس وقت سے شروع کر دی تھیں۔ جب ہندستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔

ملک کے حالات کسی تیز تحریک کے لیے ہرگز سازگار نہ تھے۔ مسلمانوں پر حیرانی اور افسردگی طاری تھی وہ ثریا سے تحت الثریٰ میں جاگرے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں اور کس طریقۂ عمل پر گامزن ہوں۔ ایسے اصحاب بہت کم نظر آتے تھے جن کے خلوص پر اعتماد کیا جا سکے۔ اور جو پیشِ نظر مقاصد کے لیے بے تکلف ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہوں۔ پھر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب کا ہدف بننے سے حتیٰ الامکان محفوظ رکھیں۔

اسلامی درسگاہوں کی تحریک:

میرے اندازہ کے مطابق انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ جن جن اصحاب میں عملی صلاحیت پائیں۔ اُنھیں جابجا خصوصاً یاغستان (آزاد قبائل) کے مختلف حصوں میں دینی اور اسلامی درسگاہیں قائم کرنے کی ترغیب دیں۔ 'ملا صاحب سنڈاکے' نے بھی حضرت شیخ الہندؒ سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے جب کام شروع کیا تو ابتدا میں ایک سلامتی درسگاہ ہی قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

''حاجی صاحب ترنگ زئی'' شیخ الہندؒ سے استفادہ کر چکے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر بھی درسگاہیں قائم کرنے ہی کا سلسلہ تھا۔

سیّد عبدالجبار صاحب ستھانوی لکھتے ہیں:

جب مجھے نمائندگانِ صوات نے بتایا کہ 'ملا صاحب سنڈاکے' اسلامیہ کالج پشاور کے بالمقابل ایک عالی شان اسلامی درسگاہ کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں تو میں نے ان پر صاف صاف واضح کر دیا۔ کہ یہ اصطلاح ایک خاص جماعت کا شعار ہے جس میں مولوی صاحبان اور علماء شامل ہیں۔ انھوں نے اسلامی درسگاہوں کو حکومت برطانیہ کے خلاف تنظیمات کا پردہ بنالیا ہے۔ اور حاجی صاحب ترنگ زئی جو اپنے ضلع میں ایسی درسگاہیں قائم کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اس حلقہ کے ایک رکن ہیں سیّد صاحب کہتے ہیں کہ مجھے یہ تو علم نہ تھا کہ اصطلاح کس نے ایجاد کی اور اس کا مرکز کہاں تھا، لیکن جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان نے واضح کر دیا تھا کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ترکوں کے دشمن حملہ آوروں کی پشت بانی کر کے خلافتِ اسلامیہ کو برباد کر دینے کے درپے ہیں۔ اِس پر مسلمانوں میں ہمہ گیر بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ علمائے حق خلافتِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے سرگرم عمل ہو گئے اس سلسلہ میں تبلیغ واشاعت کے لیے بہترین طریقہ یہ سمجھا گیا کہ گاؤں گاؤں اور بستی بستی میں اسلامی درسگاہیں قائم کر دی جائیں۔ (شہادۃ الثقلین، حصہ دوم قلمی نسخہ، ص ۳۷)

صحیح تربیت:

غرض شیخ الہندؒ کا ابتدائی منصوبہ یہی تھا اور اسے حضرت کے تعلیمی مشاغل سے خاص مناسبت تھی۔ یاد رہے کہ سیّد احمد شہیدؒ نے جب مسلمانوں کو بغرضِ جہاد منظّم کرنے کا قصد فرمایا تھا تو پیروں کے شیوہ کے مطابق مختلف علاقوں کے دورے شروع کر دیئے تھے۔ جگہ جگہ وعظ بھی ہوتے بیعت بھی لی جاتی توجہ بھی دی جاتی۔ اس طریقہ کو سیّد شہیدؒ کے مشاغل سے خاص مناسبت تھی۔ میرے نزدیک مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور مولانا رشید احمدؒ گنگوہی بانیانِ دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد ونصب العین بھی وہی تھا جس کے لیے کارفرمایانِ دیوبند میں سے صرف حضرت شیخ الہندؒ سرگرم عمل ہوئے۔ اس طریقہ اور شیوہ کے مطابق جلد حسبِ مراد نتیجے برآمد ہونے کی توقع نہ رکھی جا سکتی تھی تاہم ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ انقلابی مساعی کے ساتھ ساتھ عوام کی صحیح تربیت کا کام بھی انجام پاتا جاتا۔ جس طرح سیّد شہیدؒ کی دعوت اصلاح میں انجام پاتا تھا اُس انقلاب سے بڑھ کر مصیبت خیز اور تباہ کن شئے کوئی نہیں ہو سکتی جس کے عوام، پیشِ نظر مقاصد کی تربیت سے کاملاً بے بہرہ ہوں دریاؤں کا پانی نہروں کے ذریعہ سے کھیتوں میں پہنچتا ہے تو زمین کی اندرونی صلاحیتیں پیداوار کے

انبارفراہم کردیتی ہیں لیکن اگر وہ پانی بے پناہ سیل کی شکل اختیار کرلے تو بستیوں کی ویرانی اور فصلوں کی بربادی کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا۔

حوادث کا ھجوم و تواتر:

مجھے یقین ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ مرحوم ومغفور اپنے اسی منصوبہ کے مطابق کاربند رہنا چاہتے تھے لیکن حالات کی خوفناک مخالفانہ رفتار اور حوادث کا ہجوم وتواتر اُن کے صبر وشکیب کے لیے شدید آزمائشوں کا موجب بن گیا۔

مولانا حسین احمد فرماتے ہیں کہ حضرت کی گہری نظر واقعاتِ عالم بالخصوص ہندستان اور ترکی پر مرکوز رہتی تھی۔ طرابلس اور بلقان کے زہرہ گداز مظالم اور اندرونِ ہند میں انگریزوں کی روزافزوں چیرہ دستیوں نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ آرام وچین تقریباً حرام ہوگیا گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔ نتائج وعواقب سے بے پرواہو کر اُنھیں سر بکف اور کفن بردوش میدانِ انقلاب میں نکلنا پڑا۔ زمانہ کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں احوال کی نزاکتیں اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں۔ اور کچھ عرصہ اسی غور وخوض میں گزرا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس لیے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادرِ مطلق پر اعتماد اور بھروسہ کرکے کام شروع کردیا۔ (نقشِ حیات جلد دوم، ص ۱۳۵-ص ۱۳۶)

ابھی وہ کوئی فیصلہ کن قدم نہ اُٹھاسکے تھے کہ پہلی جنگِ یورپ شروع ہوگئی۔ دوتین ماہ بعد ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔ گویا اطمینان ودلجمعی سے آہستہ آہستہ کام جاری رکھنے اور نتائج کا انتظار کرنے کی مہلت ختم ہوگئی۔ اور اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ جو کچھ بھی ممکن ہو فی الفور کیا جائے تا کہ انگریزوں کی مشکلات میں اضافہ ہو۔ ترکوں کو تقویت پہنچے۔ اور ہندستان کی آزادی کا خواب اپنی صحیح تعبیر سے ہم آغوش ہوجائے۔

فوری کام کی ضرورت:

حضرت شیخ الہندؒ ان تمام اصحاب کی طبیعتوں اور صلاحیت استقامت کا اندازہ فرماتے رہتے تھے۔ جو ان کے پاس تعلیم واستفادہ کی غرض سے آتے۔ ان میں سے بعض موزوں اصحاب کو انھوں نے اپنے کام کے لیے چن لیا تھا۔ انھیں حکم دے دیا کہ جلد سے جلد یاغستان پہنچ جائیں۔ اور آزاد قبائل کو ہندستان پر حملہ کے لیے اُٹھائیں۔ مولانا عبیداللہ مرحوم کو انھوں نے افغانستان بھیج دیا کہ امیر حبیب اللہ خاں والئی افغانستان کو اس نازک وقت میں خدمت اسلام کے لیے جانبازانہ اقدام پر آمادہ کریں۔

حاجی صاحب ترنگ زئی اور ملا صاحب سنڈا کے متعلق ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا سیف الرحمٰن، مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود اکبر حضرت شیخؒ کے خاص کارکن تھے۔ خود ہندستان میں ان کے مخلص کارکنوں کا شمار مشکل ہے۔ مثلاً مولانا عبدالرحیم رائے پوری مولانا خلیل احمد مولانا محمد احمد چکوالی مولانا محمد صادق (کراچی) شیخ عبدالرحیم سندھی، مولانا عبدالرحیم راندیری، مولانا غلام محمد دین پوری، مولانا تاج محمود (امروٹ ضلع سکھرا ڈاکٹر مختار احمد انصاری حکیم عبدالرزاق انصاری وغیرہ سینکڑوں ایسے اصحاب ہیں جن کے نام بھی معلوم نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی حکیم اجمل خاں، نواب وقار الملک اور وقت کے اکثر بڑے بڑے رہنما حضرت شیخ الہندؒ کے مشیر ومعاون تھے۔

ابھی وہ کوئی فیصلہ کن قدم نہ اُٹھاسکے تھے کہ پہلی جنگِ یورپ شروع ہوگئی۔ دوتین ماہ بعد ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔ گویا اطمینان و دلجمعی سے آہستہ آہستہ کام جاری رکھنے اور نتائج کا انتظار کرنے کی مہلت ختم ہوگئی۔ اور اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ جو کچھ بھی ممکن ہو فی الفور کیا جائے تاکہ انگریزوں کی مشکلات میں اضافہ ہو۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ:

مولانا عبیداللہ سندھی کابل جانے کے لیے تیار ہوگئے تو اس سلسلہ میں پہلا اہم مسئلہ روپیہ کا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مقصد کے لیے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم سے ملاقات کی۔ انھوں نے بے تأمل پانچ ہزار روپے پیش کردیئے جو مولانا عبیداللہ کو دے دیئے گئے۔

معلوم نہیں اس کے سوا بھی کوئی رقم ملی یا نہ ملی دوسرا مسئلہ اخفاء کا تھا۔ خفیہ پولیس مولانائے مرحوم پر متعین تھی اور اُن کی ہر نقل وحرکت کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس مصیبت سے بچنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ مولانا بھاول

پورا اور سندھ چلے جائیں وہاں دیہات میں اس طرح رہنے لگیں گویا کوئی کام اُن کے پیشِ نظر نہیں چنانچہ وہ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں دہلی چھوڑ کر پہلے بھاولپور بعد ازاں سندھ پہنچ گئے۔ اس اثنا میں راستہ کے انتظامات بھی کرتے رہے۔ پھر ایک نکلے اور ۱۵راگست کو 'سوریا یک' کے علاقہ میں داخل افغانستان ہوئے۔ شیخ عبدالرحیم سندھی (یہ اچاریہ کریلانی کے بڑے بھائی تھے مسلمان ہوجانے کے بعد پوری زندگی تبلیغ اسلام میں بسر کردی سیاسی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ سرہند میں وفات پائی۔ میرے عزیز ومکرم دوست شیخ عبدالمجید سندھی بھی اُن کے عزیزوں میں ہیں وہ بھی اسلام لانے کے وقت سے برابر قید وبند کی تکلیفیں اُٹھاتے رہے۔ (مہر) بلوچستان کی آخری حد تک ساتھ رہے قیام افغانستان کے حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ قندھار ہوتے ہوئے ۱۵راگست ۱۹۱۸ء کو کابل پہنچے سردار نصر اللہ خاں امیر حبیب اللہ خاں اور اُن کے فرزند اکبر سردار عنایت اللہ خاں سے ملاقاتیں کیں۔ ترکی اور جرمن مشن آیا۔ اور ہندستانیوں نے حکومتِ موقتہ قائم کی۔ تو مولانا بعض وجوہ سے اس کے ہم نوا نہ رہ سکے راجہ مہندر پرتاپ صدر حکومت مؤقتہ کے متعلق مولانا کو یقین ہو چکا تھا وہ کانگریس کے بجائے ہندومہاسبھا کے کارندے ہیں اور انھوں نے خود حکومتِ مؤقتہ کی اسکیم لالہ لاجپت رائے کو دے دی تھی غالبًا اسی اسکیم کی بنا پر لالہ جپت رائے نے یہاں افغانوں کے حملہ کا افسانہ تیار کیا تھا۔ حکومتِ مؤقتہ کی طرف سے روس، جاپان اور ترکی مشن بھیجے گئے۔ مولانا ان کی تجویز وترتیب میں شریک رہے۔ افغانستان میں خدام خلق کی ایک جماعت بنائی۔ جس کا نام 'جنود اللہ' رکھا۔

امیر امان اللہ خاں کے عہد میں ایک ہندستانی تعلیم گاہ قائم کرنے کی اجازت لی لیکن برطانوی سفیر نے زور دے کر یہ اجازت مسترد کرادی ۱۹۲۳ء میں افغانستان سے نکل کر اس کو اور استنبول ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آ گئے۔

ریشمی خطوط:

مولانا نے کابل سے ایک خط ریشمی پارچہ پر لکھ کر شیخ عبدالحق نومسلم کے ہاتھ شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے پاس بھیجا تھا اور تاکید کردی تھی کہ شیخ صاحب فوراً حجاز چلے جائیں یا کسی معتمد علیہ حاجی کے ذریعہ سے خط حضرت شیخ الہندؒ کو پہنچا دیں۔ شیخ عبدالحق طلباء کے ساتھ ہجرت کرکے کابل پہنچا تھا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ نواز خاں کا ملازم تھا وہ شخص ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد تھا۔ لیکن خدا جانے کیا حالات پیش آئے کہ اس نے خط شیخ عبدالرحیم کے حوالہ کرنے کے بجائے اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر رب نواز خاں کو دے دیا۔ ان کے ذریعہ سے پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائر کے پاس پہنچا۔ اس طرح حکومت کو حضرت شیخ الہندؒ، مولانا عبیداللہؒ اور دوسرے کارکنوں کی تحریک کے کچھ راز معلوم ہوگئے۔ اُسی وقت سے شیخ عبدالرحیم کا تعاقب شروع ہوگیا اور حضرت شیخ الہندؒ کو بھی مکہ معظّمہ میں گوناگوں حوادث سے گزرتے ہوئے بالآخر گرفتاری ونظر بندی قبول کرنی پڑی۔ اصل خط کا مضمون غالبًا یہ تھا کہ حکومتِ مؤقتہ نے افغانستان سے عہد نامہ کرلیا ہے باقی حکومتوں کے پاس بھی سفارتیں بھیجی جارہی ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت ترکیہ سے بھی ربط وضبط پیدا کرنا منظور ہے۔ آخر میں حضرت موصوف سے درخواست کی گئی تھی کہ ربط وضبط پیدا کرنے اور معاہدہ کرانے میں امداد دیں۔

اِس ریشمی خط کے ساتھ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری کی طرف سے بھی ایک خط تھا (رولٹ رپورٹ میں ریشمی خط کے متعلق جو کچھ مرقوم ہے وہ غلط اور ناقص معلوم پر مبنی ہے)

حضرت شیخ الهندؒ:

ہندستان میں گرفتاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ حضرت شیخ الہندؒ بہت پریشان ہوگئے تھے۔ کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہوجائیں اور اس طرح ضروری جدوجہد کے اوقات تعطّل میں بسر نہ ہوں۔ لہٰذا وہ باہر نکل جانا چاہتے تھے اُنھوں نے اپنے دوسرے مشیروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بھی مشورہ کیا۔ مولانا آزاد کی رائے قطعی طور پر یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیے اور یہیں بیٹھ کر کام کرنا چاہیے اگر اس اثنا میں گرفتاری ہوجائے تو اسے قبول کئے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ باہر جاکر کوئی کام نہ ہوسکتا تھا۔ اور باہر رہ کر معطّل بیٹھنے سے اندر رہ کر معطّل ہوجانا بہرحال بہتر تھا۔

حضرت شیخ نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے حجاز پہنچیں۔ وہاں سے ذمہ دار ترک وزیروں اور ماموروں سے ربط وضبط پیدا کرکے ایران وافغانستان کے راستے یاغستان جائیں چنانچہ چند رفقاء کے ساتھ حجاز چلے گئے۔

حج کیا۔ اُس وقت ترکوں کی طرف سے غالب پاشا حجاز کا گورنر تھا مکہ معظّمہ کے مشہور تاجر حافظ عبدالجبّار دہلوی کے ذریعہ سے غالب پاشا کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور اُن سے تین تحریریں حاصل کیں:

(۱) پہلی تحریر مسلمانانِ ہند کے نام تھی۔
(۲) دوسری تحریر مدینہ منور کے گورنر بصری پاشا کے نام تھی جس میں مرقوم تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ معتمد علیہ شخص ہیں اُن کا احترام کیا جائے اور انھیں استنبول پہنچا دیا جائے۔
(۳) تیسری تحریر غازی انور پاشا کے نام تھی کہ ان کے مطالبات پورے کئے جائیں غالب پاشا نے خود حضرت موصوف کو تاکید کی کہ آپ تمام ہندستانیوں کو آزادی کامل پر آمادہ کریں۔ ہم ہر ممکن امداد دیں گے اور صلح کی کانفرنس منعقد ہوگی تو اس میں ہندستان کے لیے آزادی کامل کی حمایت کریں گے ان میں سے پہلی تحریر ہندستان کی تاریخ سیاسیات میں 'غالب نامہ' کے نام سے معروف ہوئی۔

انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات:

حضرت شیخ الہندؒ حج سے فارغ ہوکر مدینہ منوّرہ چلے گئے اور ابھی وہ استنبول جانے کے لیے تیار نہ ہوئے تھے کہ انور پاشا وزیر حربیہ ترکیہ اور جمال پاشا گورنر شام کے مدینہ منورہ پہنچنے کا تار آ گیا۔ چنانچہ اُن سے بھی تخلیہ میں ملاقاتیں ہوئیں۔ جمال پاشا نے وہی مطالب دوہرائے جو غالب پاشا حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے پیش کر چکا تھا۔ نیز وعدہ کیا کہ وہ شام پہنچ کر حضرت کے حسبِ خواہش ترکی عربی اور فارسی میں ایسی تحریرات بھیج دے گا جنھیں جابجا شائع کیا جا سکے۔ حضرت نے یہ بھی کہا کہ مجھے محفوظ طریق پر حدود افغانستان تک پہنچا دیا جائے تاکہ میں یاغستان چلا جاؤں۔ ہندستان کے راستہ گیا تو انگریز مجھے گرفتار کرلیں گے۔ جمال پاشاہ نے اس بنا پر معذوری ظاہری کی کہ روسی فوجیں ایران میں سلطان آباد تک پہنچ گئی ہیں۔ گویا افغانستان کا راستہ کٹ گیا ہے۔ فی الحال آپ کو افغانستان پہنچانا غیر ممکن ہے۔ واپسی میں گرفتاری کا خطرہ ہے۔ تو حجاز یا ترکی عملداری کے کسی دوسرے مقام پر ٹھہر جائیں۔

'غالب نامہ' کا ارسال:

حضرت خود حجاز ہی میں ٹھہر گئے۔ لیکن 'غالب نامہ' اور دوسرے ضروری کاغذات بطریق محفوظ ہندستان پہنچانے کی تدبیر یہ سوچی کہ کپڑے رکھنے کے لیے لکڑی کا ایک صندوق بنوایا۔ اُس کے تختے اندر سے کھود کر کاغذ رکھ دیئے پھر اُنھیں اس طرح ملا دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو پتہ نہ لگا سکے بلکہ شُبہ بھی نہ کر سکے یہ صندوق مولانا ہادی حسن رئیس خاں جہاں پور (ضلع مظفرنگر) اور حاجی شاہ بخش سندھی کے حوالہ کر دیا گیا۔ بمبئی میں جہاز پر سی۔آئی۔ڈی بھی موجود تھی اور اہل شہر بھی بکثرت آئے ہوئے تھے اُنھیں میں سے مولانا محمد نبی نام ایک مخلص نے مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو ابھی مجھے دے دیجیے۔ چنانچہ صندوق انھیں دے دیا گیا وہ اسے محفوظ نکال لائے اور توڑ کر تحریریں نکال لیں۔ دہلی میں حاجی احمد میرزا فوٹو گرافر نے اِن کے فوٹو لیے اور مولانا محمد میاں عزّت منصور انصاری کے ہاتھ یہ تحریریں سرحد بھیج دی گئیں بعدازاں حضرت نے اپنے ایک عزیز کو اس خیال سے تحریروں کا راز بتا دیا کہ وہ ہندستان واپس جا کر اُن کے فوٹو لینے اور جابجا پہنچانے کا پیغام ارباب کار تک پہنچانے کا انتظام کریں۔ مگر اُسے گرفتار کرلیا گیا۔ اور اس نے سب کچھ بتا دیا۔ جس کی بنا پر مختلف اصحاب کی تلاشیاں ہوئیں اور انھیں گونا گوں مصائب سے سابقہ پڑا۔

> **ہندستان میں گرفتاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ حضرت شیخ الہندؒ بہت پریشان ہوگئے تھے۔ کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہوجائیں اور اس طرح ضروری جدوجہد کے اوقات تعطّل میں بسر نہ ہوں۔ لہٰذا وہ باہر نکل جانا چاہتے تھے اُنھوں نے اپنے دوسرے مشیروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بھی مشورہ کیا۔ مولانا آزاد کی رائے قطعی طور پر یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیے۔**

حضرت شیخ الہندؒ کی اسیری اور ہائی:

شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ عہد و پیمان کر کے ترکوں سے غداری کی اور حجاز میں جتنے ترک موجود تھے وہ سخت و شدید ظلم و جور کا ہدف بنے حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رفیقوں کو اسیر کر کے شریف نے جدہ پہنچا دیا۔ جہاں سے انگریز پہلے مصر لے گئے پھر مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ تین برس سات مہینے کے بعد ۲۰/رمضان ۱۳۳۸ھ (۸/جون ۱۹۲۰ء) کو بمبئی پہنچا کر انھیں رہا کیا۔

زمانہ قیام حجاز میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری حکیم عبدالرزاق انصاری مولانا محمد ابراہیم راندیری وغیرہ نے حضرت کی جو خدمت کی وہ ان کے حسنات عالیہ کا گراں بہا حصہ ہے۔ ☐☐

تحریک ریشمی خطوط

تحریک کی کہانی شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی زبانی

اس تحریک کے ابتداء میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (Violence) ہندستان سے انگریزوں کا نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا ممکن نہیں ہے اور اس طرح کے انقلاب کے لیے محفوظ مرکز اور مرکز کے علاوہ اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں۔ بنا بریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا۔ کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل اور جانباز ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا۔ اور انھیں سے کامیابی کی امید قائم کی گئی۔ اس بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں۔

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے۔

(ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

(ج) ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

(د) حضرت سیّد احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے لوگ جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ستھیانہ اور چمرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں عرصہ سے چلی آتی ہیں ان کو دُور کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کے لیے مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو دہلی سے مولانا فضل ربی اور مولانا فضل محمود صاحب کو پشاور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحب وغیرہ کو آمادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس علاقہ میں بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے۔ ان سبھوں نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہموار کی اور ایک عرصہ میں بفضلہٖ تعالیٰ بڑے درجہ تک کامیابی نظر آنے لگی۔ انھیں مقاصد کے لیے بار بار حاجی ترنگ زئی صاحب سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مقاصد کے لیے کوشش کریں۔ ان کو مختلف مجبوریاں درپیش تھیں۔ ان کو حل کرنے کے خیال سے وہ تاخیر فرما رہے تھے کہ جنگ عمومی چھڑ گئی اور ترک بھی مجبور کر دیئے گئے کہ جنگ کا اعلان کر دیں۔ ان کے دو جنگی جہاز جو انھوں نے انگلستان میں بنوائے تھے اور ان پر کروڑوں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔ انگریزوں نے ضبط کر لیے اور اسی قسم کے دوسرے غیر منصفانہ معاملات ان سے پیش آئے جو کہ ان کو جنگ میں گھسیٹنے والے تھے۔ یہ ان معاملات کے علاوہ تھے جو کہ طرابلس غرب اور بلقان کریٹ یونان وغیرہ میں قریبی زمانہ میں پیش آئے تھے۔ بہر حال ترکی حکومت نے مجبور ہو کر اعلانِ جنگ کر دیا تو اس پر تقریباً آٹھ یا نو محاذوں سے حملہ کیا گیا۔ انگریزوں نے عراق (بصرہ) پر عدن پر سویز پر چناق قلعہ پر اسی طرح روس نے متعدد تین چار محاذوں پر اس یورش کی وجہ سے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے چینی ہوتی کم تھی۔ چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہندؒ نے حاجی ترنگ زئی صاحب کو مطلع کیا اور ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں اور ضروری کارروائی عمل میں لائیں۔ اسی طرح مرکز یاغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا۔ چنانچہ جب حاجی صاحب مرحوم پہنچے مجاہدین کا جمگھٹا شمار سے زیادہ ہو گیا۔ مجاہدین چمرقند (حضرت سیّد احمد صاحب شہید) کی جماعت بھی مل گئی۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور بفضلِ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی اور انگریزوں کو جانی اور مالی بے حد نقصان اٹھا کر اپنی حد پر لوٹ آنا پڑا۔ اور اپنے استحکامات قدیمہ میں پناہ لینا ناگزیر ہو گیا۔ اس پر انگریز نے بالمقابل متعدد مذکورہ ذیل کارروائیاں شروع کر دیں:

(الف) فوجوں کو اطراف ہندستان سے جمع کر کے بڑی مقدار میں سرحد پر بھیجنا۔

(ب) عوام میں پروپیگنڈا کرنا کہ یہ جہاد نہیں۔ جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا بغیر بادشاہ کے جہاد حرام ہے۔

(ج) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانانِ سرحد اور افغانوں کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہیے اور اس وقت تک انتظار کرنا ضروری ہے جب تک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں۔

(د) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانان سرحد اور افغانوں کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہیے اور اس وقت تک انتظار کرنا ضروری ہے۔ جب تک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں۔

(ہ) اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کاغذوں پر بیعت جہاد کر کے

دستخط کریں اور امیر کابل کے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کے دفتر میں یہ کاغذات بھیجیں۔

(و) امیر حبیب اللہ خاں کو مختلف وعدوں کے سبز باغ دکھلا کر اور بے شمار اموال اور نقد روپیہ دے کر اپنی طرف مائل کرنا اور جہاد کے لیے کھڑے ہونے سے روکنا اور یہ وعدہ کرنا کہ اس جنگ سے فارغ ہو کر تمھارے لیے فلاں فلاں وعدے پورے کردیئے جائیں گے۔ ان اور ان جیسی دیگر ڈپلومیسیوں کا اثر ہونا طبعی طور پر لازمی تھا۔ چنانچہ اثر ہوا اور بہت برا ہوا۔ مگر اتنا نہ ہوتا اگر مجاہدین کو رسد اور کارتوسوں کی نیز دیگر اسلحہ کی کمی کی مشکلات نہ پیش آجاتیں۔ ادھر یہ کیا گیا کہ مسلمانانِ ہند کے ہیجان اور اضطراب کے روکنے کے لیے ہندستان میں اعلان کیا گیا۔

(۱) ترکوں کو جنگ کے لیے ہم نے مجبور نہیں کیا بلکہ ترک از خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں اور ہم ان کے اعلان کی وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ (حالانکہ ترکوں کو جنگ پر انگریزوں نے مجبور کیا تھا)

(۲) یہ جنگ سیاسی ہے، مذہبی نہیں ہے۔ (حالانکہ فتح بیت المقدس پر وزیر اعظم انگلستان لائڈ جارج نے اپنے بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا)

(۳) ہم مسلمانوں کے متعدد مقامات جدہ، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، بغداد وغیرہ پر نہ بمباری کریں گے اور نہ کوئی اثر جنگ کا ان مقامات مقدسہ پر پڑنے دیں گے۔ مگر بالکل اس کے خلاف عمل کیا گیا۔

(۴) ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں۔ (حالانکہ ۱۸۵۷ء میں سلطان عبدالمجید مرحوم سے فرمان مسلمان کے لیے انگریزوں سے نہ لڑنے اور ان کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا اور ہندستان میں پروپیگنڈہ کیا کہ خلیفہ کے حکم پر چلنا مسلمانوں کے لیے مذہبی حیثیت سے فرض ہے۔ چنانچہ امیر عبدالرحمٰن مرحوم والی کابل اپنی ترک میں لکھتے ہیں: ''کہ اسی فرمان خلیفہ کی بنا پر سرحدی قبائل ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔'' بہر حال ترکوں کے خلیفہ اسلام نہ ہونے اور عدم استحقاق خلافت پر فتوے لکھائے گئے اور بار بار حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دستخط اور تصدیق کے لیے پیش کئے گئے۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کرنے سے انکار کردیا اور بھرے مجمع میں ان کو پھینک دیا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کیفیات جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ابتدائی کمزوریوں میں کارکنان مرکز کا پیغام آیا کہ ہم رسد اور کارتوس کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں۔ جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہادِ حریت جاری نہیں رہ سکتا۔ بحمد اللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں مگر اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں۔ ساتھ لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد کو اپنے گاؤں جانا پڑتا ہے اور مورچہ خالی ہو جاتا ہے اور کارتوس کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے۔ اگر کارتوس اور رسد کافی مقدار میں ہو تو توپوں اور مشین گنوں، ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لیے تیار کیجیے۔ چنانچہ اس امر کی بنا پر شیخ الہند کا ارادہ بدلا اور مولانا عبیداللہ صاحب کا ارادہ بدلا اور مولانا عبیداللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہنچانا ضروری قرار دیا۔

چونکہ اس وقت کے واقعات ہو رہے تھے۔ حکومت بوکھلائی ہوئی تھی اور وہ معمولی شبہ پر بھی گرفتار کرکے نظر بند کررہی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سی آئی ڈی کی اطلاعات خود ہندستان میں اور سرحد یاغستان میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں اس لیے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اسی وجہ سے زور دیا تھا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عملداری سے نکل جائیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز جانے کا ارادہ کرلیا۔ پہلے سے کوئی تذکرہ نہ تھا۔ فوراً روانہ ہو گئے۔

مکہ معظّمہ میں بہت سے ہندستانی تاجر کاروبار کرتے ہیں مگر دہلی کے تاجر حاجی علی جان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے۔ تجارت بھی ان کی بڑی پیمانے پر ہے اور دینداری اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے۔ اہل شہر اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان خاندان کا حضرت سیّد احمد شہید اور ان کے متبعین مجاہدین ستھیانہ وغیرہ سے بھی قدیمی تعلق ہے اس لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حافظ عبدالجبار صاحب سے جو کہ اس خاندان میں معمر سمجھ دار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے ملے اور ان سے معاملات کا ذکر کرکے گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کرانے کی استدعا کی۔

انھوں نے اسی وقت ایک ہندستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جو کہ تسبیحوں کی تجارت کراتے تھے اور ترکی اور عربی زبان سے خوب واقف اور وہاں کے ترکی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے، بلایا اور حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ کردیا۔ وہ گئے اور غالب پاشا سے ملاقات کرادی اور جو باتیں حضرت شیخ الہندؒ نے کیں ان کا ترجمہ کرکے غالب پاشا کو سمجھایا۔ غالب پاشا نہایت توجہ اور غور سے تمام باتوں کو سنتے رہے معمولی ملاقات کے بعد کہا کہ آپ کل اسی وقت تشریف لائیں اس وقت میں جواب دوں گا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس روز واپس آگئے۔ غالب پاشا نے ہندستان کے معزز تاجروں سے بالا بالا تحقیق کی کہ مولانا محمود حسن صاحب کی حیثیت ہندستان میں کیا ہے۔ لوگوں نے حضرت کی علمی اور عملی حیثیت شہرت اور

قبولیت کی بہت اونچی شان بتلائی۔ لہٰذا اگلے دن جب حضرت ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو بہت زیادہ اعزاز کیا اور نہایت تپاک سے ملے۔ اور جو کچھ حضرت نے کہا اس کو قبول کیا۔ دیر تک تحریک اور مشن آزادی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ ان سے ملنے کی کوئی ضرورت آپ کو نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے۔ مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے پر اصرار کیا تو انھوں نے ایک تحریر تمام ہندستانی مسلمانوں کے لیے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ کر دی اور ایک تحریر مدینہ منورہ بصری پاشا کو لکھی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کا احترام کرواور ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچادو اور ایک تحریر انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کے مطالبات پورے کیجیے پھر تحریکِ آزادی کے متعلق حضرت شیخ کو ہدایات کیں کہ آپ تمام ہندستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا ضرور کریں گے۔ عنقریب صلح کی مجلس منعقد ہوگی تو ہم اور ہمارے حلفاء جرمنی اور آسٹریلیا وغیرہ ہندستان کی مکمل آزادی کے لیے پوری جدوجہد کریں گے۔ ایسا نہ ہونا چاہیے کہ ہندستانی لیڈر سست پڑجائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آکر اس کے انتداب (میڈیٹ) یا اس کی تابعداری پر راضی ہوجائیں۔ تمام ہندستانیوں کو اخباروں عام مجمعوں، تقریروں، تحریروں، اندرون ہند اور بیرون ہند ایک زبان اور ایک قلم ہو کر یہی مطالبہ جاری رکھنا چاہیے اور جب تک مقصد حاصل نہ ہوجائے، ساکت نہ ہونا چاہیے۔ اس کا پروپیگنڈہ پوری طرح پر جاری کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے آپ کو واپس جانا اور آپس میں اتفاق اور اتحاد کے ساتھ مطالبہ کرانا ازبس ضروری ہے۔

حضرت نے فرمایا اس وقت انگریز نہایت ہی خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں اگر ہندستان جاؤں گا تو راستہ ہی میں گرفتار کرلیا جاؤں گا۔ مگر میں اپنے رفقا کو اس کام کے لیے تیار کر کے ہندستان بھیجتا ہوں اگرچہ وہاں کی جماعتیں کانگریس وغیرہ اس پر عمل درآمد کر رہی ہے مگر اب آپ کے حکم کے موافق کوشش زیادہ ہوگی اور پہلے سے زیادہ زوردار طریقہ پر یہ مطالبہ جاری کیا جائے گا۔ میں بالفعل بالا بالا ہندستان کی مغربی حدوں میں جانا چاہتا ہوں وہاں میرے مشن کے لوگ کام کر رہے ہیں۔ ان میں مل کر کام کروں گا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد جب تک وہ مکہ معظّمہ میں رہے دو تین ملاقاتیں نہایت راز کے ساتھ ہوئیں۔ مکہ معظّمہ کے ہندستانی باشندوں یا انگریزی سی آئی ڈی کو خبر نہیں ہو سکی۔ پھر غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کو روانہ ہوگئے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں تھوڑے دن قیام کر کے استنبول کو روانہ ہوں گے۔ اپنے تمام ساتھیوں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، مولانا سہول صاحب وغیرہ کو آخری قافلہ میں مدینہ منورہ سے ہندستان کو روانہ کر دیا۔ جدہ پہنچ کر ان کو کوئی جہاز ہندستان جانے والا نہ ملا۔ اس لیے وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔

جدا ہوتے وقت مرتضیٰ حسن صاحب کو دیوبند کے مرکز پر کام کرنے کی ہدایات فرمائیں اور بہت سے خفیہ امور پر مطلع فرمایا اور مولوی محمد میاں صاحب کو جو کہ بعد میں محمد منصور الانصاری کے نام سے مشہور ہوئے، خاص شعبوں کی نگرانی سپرد کی۔ غالب پاشا کی تحریر بھی ان کو دی گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اگرچہ پہلے سے اس تحریکِ آزادی میں شریک نہیں تھے۔ مگر مدینہ منورہ میں پہنچ کر بالکل متحد اور ہمنوا ہوگئے تھے۔

میں اس وقت نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جبکہ محاذ سوئز کے لیے مدعوئین (والنٹیئر) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا۔ ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لیے مدینہ منورہ سے گئے تھے۔ مگر اس کے علاوہ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاست کی ابدا اور بسم اللہ کا وقت ہے۔ اور یہی وقت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین۔ اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب جب تک حجاز میں رہے بالکل متفق اور ہمنوا رہے۔

اس وقت مدینہ تک حجاز ریلوے جاری تھی۔ ٹرین آتی جاتی تھی۔ ایک روز یکا یک تار آیا کہ یہ دنوں وزیرانِ جنگ دورہ کرتے ہوئے کل کو مدینہ منورہ پہنچیں گے۔ ہم نے بھی عرضی تیار کی۔ حکومت مدینہ منورہ بھی استقبال کی تیاری میں مشغول ہوگئی اور اہلِ شہر بھی استقبال کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ چونکہ انور پاشا اس زمانے میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا چوتھے فلیق (ڈویژن) کے جو کہ محاذ جنوبی اور عربی پر یعنی میدان سوئز، سینا، حجاز پر متعین تھا، کمانڈ تھے۔ اس لیے انور

پاشا کا فریضہ تھا کہ مرکز کی خبر گیری کرتے ہوئے ہر محاذ کی محافظت کریں اور جمال پاشا کو صرف اپنے محاذ کی خبر گیری ضروری تھی۔ اس لیے انور پاشا تمام محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے جب محاذ جنوبی غربی پر پہنچے اور سوریا (سیریہ شام) اور سوئز وغیرہ سے فارغ ہوئے تو ضروری معلوم ہوا کہ بادشاہ دوجہاں سرورِ کائنات علیہ السلاۃ والسلام کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرلیں۔ اس لیے مدینہ منودہ کی حاضری کا ارادہ کیا اور جمعہ کا مبارک دن اس کے لیے مقرر کیا۔ چنانچہ جمعہ کی صبح کو تقریباً نو یا دس بجے وہ اسپیشل ٹرین جس میں یہ دونوں وزرا اور اور رفقا تھے۔ حسب اعلان مدینہ منورہ پہنچی۔ وقت متعین سے پہلے مشتقانہ ملاقات اور زائرین کی بے شمار تعداد نے تمام اسٹیشن اور اس کے جوانب کو بھر دیا تھا۔ اہل شہر اور حکومت اور فوج کی طرف سے جلوس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ (نقش حیات)

میں مولانا (حسین احمد صاحب) تاک میں تھا کہ موقع ملے تو انور پاشا کے پاس پہنچوں اور عرضی پیش کردوں۔ چنانچہ قطار چیر کر انور پاشا کے پاس پہنچا اور اس عرضی کو (جس میں حضرت شیخ نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی تھی) پیش کردی۔ انھوں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو دے دی۔ مفتی ماموں بری کو جو کہ مدینہ منورہ میں تمام مذہبی اور دینی طبقات کے رسمی سردار تھے اور نقیب الاشراف شامی رحمہ اللہ کو جو کہ رفقائے انور پاشا میں سے تھے، میں نے پہلے سے تیار کرلیا تھا۔ ان کی اعانت اور ہمدردی کی وجہ سے مجھ کو کسی طرف سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ میں عرضی دے کر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر غور کیا گیا اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی مساعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ اللہ رحمہ اللہ موقعہ ملاقات پر پہنچے۔ ایک تنہا اور بند کمرے میں ملاقات ہوئی۔ جمال پاشا سے باتیں ہوئیں۔ غالب پاشا کا خط ان کو دکھایا گیا۔ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور تمام باتیں غور اور اطمینان سے سنیں۔ اور فرمایا کہ تحریک مطالبہ آزادی اہلِ ہند کو متفقہ طور سے جاری رکھنی چاہیے جب تک مقصود یعنی آزادیٔ کامل حاصل نہ ہوجائے ساکت نہ ہوں۔ عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی۔ ہم اہل ہند کی آزادی کے لیے پوری جدوجہد عمل میں لائیں گے۔ تم لوگ مطمئن رہو اور جس طرح ممکن ہوگا اہل ہند کی امداد واعانت کریں گے۔ اس وعدہ اور عہد کے لیے انھوں نے کہا تمھاری خواہش کے موافق تحریر بھی دیں گے۔ ہم نے عرض کیا کہ تحریر صرف ترکی زبان میں نہ ہونی چاہیے بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ہونی چاہیے تاکہ اہلِ ہند سمجھ سکیں۔ انھوں نے اس کو قبول کیا مگر یہ کہا کہ چونکہ یہاں کا قیام حسب پروگرام تھوڑا ہے اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں اس لیے ہم شام (دمشق) جاکر تحریریں مکمل کرکے بھیج دیں گے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو حدود افغانستان تک بالا بالا پہنچا دیا جائے۔ ہندستان کے راستہ سے مجھ کو وہاں تک (مرکز تحریک یاغستان تک) اس وقت پہنچنا غیر ممکن ہے۔ انھوں نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کرکے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور سلطان آباد تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے یہ امر ہمارے قبضہ سے اس وقت باہر ہے۔ یا تو آپ جدہ ہی کے راستہ سے اپنے وطن واپس جائیں اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی عملداری میں کسی دوسری جگہ قیام فرمائیں۔ اطمینان بخش باتوں کے ہوجانے کے بعد ہم واپس آگئے۔ چند گھنٹے بعد یہ حضرات شام کے لیے روانہ ہوگئے۔ پھر دو تین روز بعد حسبِ وعدہ یہ تحریریں بھی تینوں زبانوں میں مرتب شدہ دونوں وزیروں کے دستخط سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے پاس بذریعہ گورنر مدینہ شام سے آگئیں۔

مضمون سب کا ایک ہی تھا، صرف زبان کا فرق تھا۔ جس میں ہندستان کے مطالبہ آزادی کے استحسان اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بارے میں امداد واعانت کا وعدہ تھا اور ہر اس شخص کو ترکی رعیت یا ملازم ہو، حکم تھا کہ مولانا محمود حسن (شیخ الہندؒ) پر اعتماد کرے اور ان کی اعانت میں حصہ لے۔

چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کو دھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو میں مرکز تحریک یاغستان جلد از جلد پہنچ جاؤں۔ (اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ترکی آفیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلمرو میں قیام کرکے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں) اس لیے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد لیے جائیں اور ہر مرکز اور برانچ پر وہ پہنچا دیئے جائیں۔ مگر انگریزی عملداری میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تفتیش ہوتی تھی۔ کسی چیز کا نکال کر لے جانا نہایت ہی مشکل ہوتا۔ اس لیے تجویز ہوئی کہ لکڑی کا صندوق کپڑوں کے رکھنے کا بنوایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دیئے جائیں اور پھر تختوں کو اس طرح ملا دیا جائے کہ جوڑ ظاہر نہ ہو۔ اس وقت ایک نہایت ماہر اور استاد بڑھئی ہمارے مکان میں لکڑی کا کام کررہا تھا۔ اس سے کہا گیا۔ اس نے اسی طرح جاوی لکڑی کا صندوق بنا دیا اور کھدے ہوئے تختہ میں کاغذات رکھ کر اس طرح بند کردیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو شبہ بھی نہ کرسکے۔ صندوق میں کچھ زائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اور کچھ نئے کپڑے اور شامی

تھان ریشمین اور غیر ریشمین مشجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لیے رکھ دیئے گئے۔ اور چونکہ ہر مہینہ تجارتی جہاز مغل کمپنی کا غلّہ اور سامان لے کر جدہ آتا تھا اور واپسی پر بقیہ حجاج کو لے جاتا تھا۔ تجویز ہوا کہ اس میں حضرت شیخ الہندؒ کے بقیہ رفقا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور ان کے رفقا روانہ کر دیئے جائیں۔ چونکہ زمانہ جنگ کا تھا اس لیے جہازوں کی آمد ورفت عام دستور کے مطابق جاری نہ تھی۔ اس لیے کچھ انتظار کرنا نہ تھی۔ اس لیے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے رفقا میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خان جہانپور ضلع مظفرنگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی (جو کہ حیدر آباد سندھ کے باشندے اور مشن آزادی کے پہلے سے ممبر تھے) باقی رہ گئے تھے اور جانے کا قصد فرما رہے تھے۔ ان کو وہ صندوق دے دیا گیا اور سمجھا دیا گیا اپنے مکان پر کاغذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن (رئیس موضع رتھیڑی ضلع مظفرنگر) کو دے دیں۔ وہ احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے ان تحریروں کے فوٹو اتروا کر چند کاپیاں لے لیں گے اور فلاں فلاں جگہ پہنچا دیں گے۔

حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقا کا قافلہ ۱۲/ جمادی الثانی کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر آخری ماہ کورہ میں مکہ معظّمہ پہنچا۔ حضرت شیخ الہندؒ قدس اللہ العزیز نے چند روز مکہ معظّمہ میں قیام فرما کر طائف کا قصد فرمایا۔ اور ۲۰/ رجب کو آپ طائف روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور دیگر رفقا مکہ معظّمہ میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہو گئے۔ جب ۱۰/ شوال کو طائف سے واپس ہو کر مکہ معظّمہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب اور دوسرے رفقا جہاز آ جانے کی وجہ سے جدہ روانہ ہو گئے ہیں۔ چونکہ کوئی خبر حضرت شیخ الہندؒ کے طائف سے واپس ہونے کی نہیں تھی اس لیے یہ سب حضرات بغیر انتظار اور بلا ملاقات روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ضروری سمجھا کہ ان سے وداعی ملاقات کی جائے۔ اس لیے حضرت شیخ الہندؒ بھی جدہ روانہ ہو گئے۔ جب جہاز سامان وغیرہ اُتار کر اور اپنی ضروریات پوری کر کے تیار ہو گیا تو جانے والے حضرات ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب تھے۔ اور حضرت رحمہ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے مولانا ہادی حسن صاحب خان جہانپوری اور حاجی خان بخش صاحب سندھی تھے۔ ان سبھوں کو حضرت شیخ الہندؒ نے ساحل (پورٹ) تک رخصت کیا اور جہاز روانہ ہو گیا۔ بمبئی میں سی آئی ڈی کو اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین کو خیال تھا کہ اسی جہاز میں حضرت شیخ الہندؒ تشریف لائیں گے۔ اس لیے انگریزی پولیس سی آئی ڈی اور اہلِ شہر کا بہت بڑا مجمع جہاز پہنچ گیا تھا۔ اسی مجمع میں سے ایک صاحب نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین میں سے تھے مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو مجھ کو فوراً دے دیجیے۔ میں اس کو نکال دوں گا اور جہاں پہنچانا ہو اس کا پتہ دے دیجیے وہاں پہنچا دوں گا۔ مولانا ہادی حسن صاحب اگرچہ پہلے سے ان سے واقف نہیں تھے مگر ان کے مخصوص انداز سے ان کے اخلاص اور صداقت کا یقین ہو گیا اور صندوق ان کے حوالہ کر دیا۔

یہ صاحب عام مسافروں کے سامان کے ساتھ صندوق قلیوں سے اٹھوا کر لے گئے اور فوراً اسٹیشن لے جا کر بذریعہ پارسل چلتا کر دیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کو اس کی ہوا بھی نہ لگ سکی۔ (یہ حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت تھی) جب یہ صاحب صندوق اٹھوا کر لے جا رہے تھے اس وقت سی آئی ڈی حضرت شیخ الہندؒ کو ڈھونڈنے میں مشغول تھی۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نہیں ہیں البتہ ان کے ساتھ کچھ لوگ ہیں تو پولیس حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا ہادی حسن صاحب کو حراست میں لے لیا اور نہایت سخت تلاشی لی حتیٰ کہ ہاتھ کی چھڑی توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ مگر بحمد اللہ کوئی مشتبہ چیز نہیں نکلی۔ پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں نینی تال پہنچا دیا گیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے وہاں پوچھ گچھ ہوئی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز سے فلاں تاریخ کو گیا تھا۔ مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ کا ساتھ نہ جاتے میں تھانہ آتے ہیں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح حج وزیارت میں میری شرکت بھی رہی۔ میں ان کی پارٹی میں نہیں ہوں۔ ایک ہفتہ یا عشرہ حضرت مولانا موصوف کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مولانا حاجی ہادی حسن صاحب کو روک لیا گیا۔ ان سے بہت زیادہ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈرایا دھمکایا گیا، سختی بھی کی گئی اور لالچ بھی دیا گیا۔ مگر یہ نہایت مستقل رہے۔ کسی راز کی خبر نہیں دی۔ جب ہر قسم کی سختی اور طمع دینے پر بھی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی تو ایک ڈیڑھ ماہ بعد آپ کو بھی رہا کر دیا گیا۔

مولانا محمد نبی صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی راز کی چیز ہے۔ لہٰذا جیسے ہی صندوق پہنچا اس کے کپڑے نکال کر لکڑی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیئے اور اس صندوق کو توڑنا شروع کر دیا۔ مولانا کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی۔ اور ایک تختہ کے اندر ضروری کاغذات برآمد ہوئے۔ فوراً ہی ان کاغذات کو نکال کر محفوظ کر لیا۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک صاحب کے بیان سے سی آئی ڈی نے پتہ چلایا کہ وہ کاغذات لکڑی کے ایک صندوق میں مولانا ہادی حسن صاحب

کے یہاں ہیں۔ فوراً مولانا کے مکان پر پولیس کی دوڑ پہنچی اور مکان کا محاصرہ کرلیا۔ ایک عجیب وغریب اتفاق تھا کہ مولانا محمد نبی صاحب اسی وقت ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کررہے تھے۔ سپاہیوں کی دوڑ دیکھ کر جلدی میں ان کاغذات کو موڑ توڑ کر صدری کی جیب میں رکھ لیا اور صدری مردانہ مکان میں ایک کھونٹی پر لٹکا دی۔

تلاشی ایک بجے سے شروع ہوئی اور نہایت سختی کے ساتھ چار بجے تک جاری رہی۔ عورتوں کو ایک کمرہ میں بند کردیا گیا۔ ہر شخص کی تلاشی لے کر مردانہ مکان میں سے بھی نکال دیا گیا۔ کھیل کھلونوں اور عورتوں بچوں کی ڈبیوں تک کو کھول کھول کر دیکھا گیا۔ کپڑوں کے صندوق کی سختی آئی اس کا ایک ایک تختہ توڑ کر ریزہ ریزہ کردیا گیا۔ مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ دستیاب نہ ہوئی کیونکہ یہ صندوق وہ صندوق ہی نہ تھا اور عجیب اتفاق یا حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت یہ تھی کہ اس صدری پر کسی کی نظر نہ گئی جو مردانہ مکان میں سب کے سامنے کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی اور جس میں وہ خزانہ تھا جس کی جستجو میں پولیس سرگرداں تھی۔ چھ گھنٹہ کی سرگرم تفتیش اور تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ موضع رتھیڑی بھی ضلع مظفر نگر میں ہے یہاں جناب حاجی نورالحسن صاحب رہتے تھے جن کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہٗ العزیز نے یہ طے فرمایا تھا کہ وہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر اور اس کی کاپیاں کرا کر فلاں فلاں مرکز میں بھیجیں گے پولیس حاجی صاحب کے یہاں بھی پہنچی مگر ناکام واپس ہوئی۔

سراغ رساں نے پولیس کو صحیح بتایا تھا کہ حاجی احمد مرزا صاحب کے یہاں تحریروں کے فوٹو لیے جائیں گے۔ چنانچہ پولیس نے حاجی صاحب کی دوکان پر چھاپہ مارا مگر اب تک وہ تحریریں حاجی صاحب کے یہاں نہیں پہنچی تھیں۔ حاجی نورالحسن صاحب رحمۃ اللہ اسی وقت ان کو لے جارہے تھے جب حاجی صاحب فوٹو گرافر صاحب کی دوکان کے قریب پہنچے تو دیکھا پولیس دوکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ حاجی صاحب ان تحریروں کو جیب میں ڈالے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہوگئے۔ دوسرے وقت حاجی نورالحسن صاحب مرزا صاحب کی دوکان پر پہنچے۔ مرزا صاحب کی ثابت قدمی اور پختگی ملاحظہ کیجیے کہ پولیس ایک دفعہ چھاپہ مار چکی ہے۔ خدشہ اور خطرہ موجود ہے۔ مگر ہر خطرہ سے بے نیاز ہوکر حاجی صاحب نے فوٹو لیے۔ عین اسی وقت کہ پلیٹیں پانی میں پڑی ہوئی تھیں اور پانی کا طشت میز کے نیچے رکھا تھا۔ پولیس پہنچ گئی۔ ساری دوکان چھان ماری۔ ہر ایک البم ٹٹولا۔ مگر طشت پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اس کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کرامت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

بہرحال پولیس یہاں سے بھی ناکام واپس ہوئی۔

فوٹو کاپیاں تیار ہوگئیں۔ حاجی نورالحسن صاحب نے ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور جہاں جہاں پہنچانے کا حکم تھا پہنچادیا۔ یہ غلط ہے کہ ان تحریرات کو جلا دیا گیا۔ جیسا کہ مولانا عبیداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ وہ اس زمانہ میں کابل میں تھے ان کو غلط خبر پہنچائی گئی۔ یہ تمام فوٹو ذمہ داران مراکز کے پاس پہنچا تو دیئے گئے تھے مگر چونکہ حکومت کی طرف سے تشدد اور چھان بین بہت زیادہ ہورہی تھی تو ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے ان کو جلا دیا ہوتا کہ کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

یہ تحریرات اور وثائق بہت زیادہ کارآمد ہوتے اور حکومت ترکیہ اور اس کے حلیف پوری امداد کرتے مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ جرمنی اور ترکی کی فتح مندی اور کامیابی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف ہوگیا اور مسٹر ولسن کے پُرفریب نکات سامنے آئے تو یکایک حالت بدل گئی اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی۔ امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار جب اتحادیوں (انگریزیوں اور فرانس وغیرہ) کی مدد پر آ گئے اور ادھر شریف حسین نے غدر اور خیانت کرکے انگریزوں کی حمایت میں ترکوں اور ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچایا۔ عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلا دی۔ تا آنکہ سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل و غارت کرتے تھے اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے اور جدوجہد سے کام چرانے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی ہی ناکامی سامنے آ گئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا وہ واقع ہوگیا۔ تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا ملک ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ جس سے چاہے چھین لیتا ہے۔

انور پاشا جمال پاشا سے جب تحریری دستاویزیں حاصل کرلیں تو حضرت شیخ الہندؒ کا قصد تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالا بالا یاغستان (یعنی اپنی تحریک کے مرکز پر) پہنچ جائیں۔ مگر روسی اور انگریزی فوجوں نے راستہ روک لیا تھا۔ جنگی محاذ ان راستوں پر قائم ہوگئے تھے۔ اس لیے یہی قصد فرمایا کہ بحری راستہ سے سفر کیا جائے اور بمبئی نہ جایا جائے بلکہ بلوچستان کے کسی بندر (مکران وغیرہ) بھیس بدل کر بادبانی جہاز سے پہنچیں اور پھر یاغستان کو وہاں سے روانہ ہوجائیں۔ مگر چونکہ مختلف مصالح سے آخری ملاقات غالب پاشا سے ضروری سمجھتے تھے۔ چند ضروری باتیں اسی ملاقات میں طے کرنی تھی۔ اس لیے پہلے مکہ معظّمہ اور پھر وہاں سے طائف کے لیے روانہ ہوگئے۔ غالب پاشا ان دنوں طائف میں تھے۔ حضرت نے عام لوگوں سے یہی ظاہر فرمایا کہ مکہ معظّمہ

میں ان دنوں گرمی زیادہ ہے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زیارت بھی کرنی ہے۔ اس لیے میں طائف جا رہا ہوں۔ نصف شعبان تک واپس آجاؤں گا۔ چنانچہ طائف ۲۰؍رجب کو مکہ معظّمہ سے روانہ ہوکر ۲۳ یا ۲۴؍رجب کو طائف پہنچے۔ اور دو تین دن کے بعد غالب پاشا سے ملاقات کی۔ کچھ باتیں طے ہوئیں اور کچھ کے لیے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہ وقت آنے نہ پایا تھا کہ شریف حسین نے بغاوت کردی اور ہم سب طائف میں محصور ہوکر رہ گئے۔

ایام حصار میں حضرت ایک مرتبہ غالب پاشا سے پھر ملے۔ پاشا موصوف نے چند اصولی باتیں بتانے کے بعد مجبوریاں ظاہر کیں اور کہا کہ آپ مکہ معظّمہ جاکر ہندستان کو جلد از جلد چلے جائیں۔ اور ہندستان رائے عامہ کو آزادی کامل کے مطالبہ پر متفق کریں۔ مجلس صلح میں جو کہ عنقریب منعقد ہونے والی ہے انگریز پوری کوشش کرے گا کہ ہندستان آزادانہ ہو یا کم از کم ہندستانیوں کو زیر سایہ برطانیہ اور اندرونی آزادی یعنی آدھی آزادی ملے مگر ہندستانی باشندوں کو چاہیے کہ بغیر مکمل آزادی کے کسی چیز پر راضی نہ ہوں۔ تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد اہل طائف کے ساتھ ہم کو باہر جانے کی سہولت حاصل ہوئی اور ۶؍شوال ہم وہاں سے نکل کر مکہ معظّمہ پہنچے۔ شریف عبداللہ بن شریف حسین باغی کیمپ کا کمانڈر تھا۔ اس نے ایک شب ہماری مہمان داری کرکے صبح کو مکہ معظّمہ تک سواری کا انتظام کردیا۔ ہم ۱۰؍شوال کو مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس سفر میں پہلا حج ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ میں کیا تھا۔ پھر دوسرا حج طائف سے واپسی پر ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں کیا۔ قاضی مسعود احمد صاحب اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہوجانے کے بعد حضرت کو فکر ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہوکر یاغستان پہنچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ حضرت نے بار بار فرمایا کہ مکہ معظّمہ میں ہمارا قیام کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ انگریزی حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلۂ کار ہیں لہٰذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔ اس لیے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیے کہ یہاں سے روانہ ہوجائیں لیکن اگر تنہا حضرت کی ذات مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا۔ مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے چند رفقا تھے جو اپنا سب کچھ قربان کرکے حضرت کے ساتھ ہوئے تھے۔ وہ حضرت کو کسی حال چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ حضرت ان کی جدائی پسند کرتے تھے۔ کیونکہ ترجمہ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ ساتھ رہتا تھا۔ سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بنا پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھی۔ ان سب کے حمل ونقل کے لیے چند سواریاں درکار تھیں اور خاموشی سے دفعتاً روانہ ہوجانا مشکل تھا۔ تاہم جب حضرت کا تقاضہ شدید ہوا تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہوجائے۔

چنانچہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے والے تھے کہ تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہوگئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔ محرم ۱۳۳۵ھ کی آخری تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظّمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علماء مکہ عصر کے بعد آیا۔ اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے۔ مولانا کے اس پر دستخط کرادو۔ اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا۔ ''من علماء مکۃ المکرّمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی'' (مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں) اور اس میں تمام ترکوں کی تکفیر اس بنا پر کی گئی تھی کہ انھوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو معزول کیا ہے۔ شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ اور کہا کہ چونکہ یہ محضر ان علماء مکہ مکرمہ کی طرف سے ہے جو کہ حرم مکی میں پڑھاتے ہیں اور میں ہندستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں۔ اس لیے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں ہے۔ وہ واپس چلا گیا۔

حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ پھر کیا کیا جائے۔ نہ عنوان اجازت دیتا ہے نہ معنون۔ معنون میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ سراسر خلاف شریعت ہیں۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے۔ خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔

دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا اور سیّد ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کرکے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طریقوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ نفع نہیں ہوا۔ شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ خفیہ عہد و پیمان کرکے ترکوں سے غداری کی اور حجاز میں جتنے ترک موجود تھے وہ سخت و شدید ظلم و جور کا ہدف بنے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفیقوں کو اسیر کرکے شریف نے جدہ پہنچا دیا جہاں سے انگریز پہلے مصر لے گئے پھر مالٹا میں نظر بند کردیا۔ تین برس سات مہینے کے بعد ۲۰؍رمضان ۱۳۳۸ھ (۸؍جون ۱۹۲۰ء) کو بمبئی پہنچا کرانھیں رہا کیا۔ □□

ریشمی خطوط کے کیس کا خلاصہ

زیر نظر کیس کو ہم اپنی آسانی کے لیے ریشمی خطوط کا کیس اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس بارہ میں ہمیں گہری اور مکمل واقفیت اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے تین خطوط کے پکڑے جانے سے حاصل ہوئی۔ جو کابل میں موجود سازشیوں نے حجاز میں موجود سازشیوں کو بھیجنے کے لیے روانہ کئے تھے۔ یہ واقعات جو اس تفتیش اور تحقیقات کا باعث ہیں ان کا سلسلہ ۱۹۱۵ء کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔

(۱) افغانستان کو پنجابی طلبا کا مشن:

اس سال ماہ فروری میں پنجاب کے مختلف کالجوں کے پندرہ طلبا خفیہ طور سے اپنے گھروں سے روانہ ہوئے۔ اور شمالی مغربی سرحد کو عبور کرکے آزاد علاقہ میں پہنچے۔

پھر دوسرے طلبا نے ایک ایک کرکے یا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں ان کی پیروی کی۔ بعد کی اطلاعات سے ظاہر ہوا کہ ان کی اس کارروائی کا محرک سلطنت برطانیہ کی مخالفت کا جذبہ تھا۔ ترکی سے برطانیہ کی جنگ اس کا سبب تھی۔ جس کے خلاف غیر وفادار واعظوں اور مبلغوں نے نہایت زبردست مکروہ پروپیگنڈا کیا تھا۔ ان جوانوں کا ارادہ اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ پہلے تو وہ برطانوی قلمرو سے نکل جائیں اور پھر جس کام کے لیے بھی ان میں صلاحیت ہو۔ جیسے جاسوس۔ قاصد، واعظ، یا مبلّغ جہاد یا فوجی اس کام کے لیے وہ اپنی خدمات ترکوں کو پیش کردیں۔

انھیں اُمید تھی کہ افغان گورنمنٹ کی عنایت اور تعاون سے وہ ترکی پہنچ سکیں گے انھیں توقع تھی کہ افغانستان برطانیہ عظمٰی سے برسر جنگ ہونے والا ہے۔ یا ہندستان کے غیر وفادار لوگ بدگمانیاں پیدا کرکے اور دباؤ ڈال کر اسے لڑائی پر مجبور کردیں گے۔

۱۹۱۵ء میں جو تفتیش اور تحقیقات کی گئی اس سے اس اہم واقعہ کا بھی انکشاف ہوا کہ صوبہ سرحد تک طلبا کے سفر کا انتظام پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں وہابیوں کی ایک جماعت کرتی تھی۔ اور برطانوی قلمرو کے عبور کرلینے کے بعد طلبا کو سرحد پار کے وہابی بُنیہ پہنچا دیئے تھے جو آزاد علاقہ میں اُن وہابیوں کی بستی ہے۔ جن کو مجاہدین یا متعصب ہندستانی کہا جاتا ہے۔

(۲) ہندستان میں وھابیت:

اُنیسویں صدی کے شروع میں عرب کے وہابیوں کی تحریک ہندستان میں داخل ہوئی بریلی کے مولانا سیّد شاہ نے گنگا کی وادی میں اسے رائج کیا (جہاں سے یہ بڑی تیزی سے بالائی ہندستان میں پھیل گئی) انھوں نے ۱۸۲۳ء میں کچھ پیروؤں کے ہمراہ خود بھی شمالی مغربی سرحدی صوبہ کو عبور کیا۔ اور یوسف زئی قبائل کے علاقہ میں مجاہدین یا متعصب ہندستانی مسلمانوں کی ایک بستی قائم کی تب سے یہ ہندستان کے بے دین حکمرانوں کے لیے عذاب بنی ہوئی ہے۔

شروع میں اس کا قیام خاص اس مقصد کے لیے عمل میں آیا تھا۔ کہ سرحدی قبائلیوں کو سکھوں کے خلاف جہاد کے لیے اُکسائے۔ جو اس وقت پنجاب پر قابض تھے۔ تب سے بستی ہندستانی وہابیوں کی مالی امداد سے اور ہندستان سے یہاں آتے رہنے والے، نوجوان وہابیوں کی وجہ سے میدانِ جنگ میں ہزیمتیں اُٹھانے اور برطانیہ کے دوست قبائل کی طرف سے سیاسی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنے کے باوجود تاہنوز قائم ہے۔

ہندستان میں ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۳ء تک وہابیوں کے خلاف عدالتی تحقیقات اور مقدمات کے طویل سلسلہ کے دوران ہندستان میں سازشیں کرنے اور روپیہ جمع کرکے اسے سرحد پار کے متعصب ہندستانیوں کو بھیجنے والی ایک جماعت کا پتہ چلا تھا جس پر کئی بڑے بڑے وہابیوں کو سزائیں دی گئی تھیں اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب یہ تحریک ہندستان میں گویا ختم ہوگئی ہے۔ اس کے بعد ہندستان میں وہابی عقائد کے ماننے والے مختلف ناموں سے پکارے جانے لگے۔ جیسے اہلِ حدیث، غیر مقلد، فرازی وغیرہ اور جلد ہی ہندستان سے وہابیوں کا بظاہر نشان مٹ گیا۔ سرحد پار بھی مجاہدین کی بستی کی طاقت اور اثر گھٹ گیا۔ بعد میں اس کا اثر نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

۱۹۱۰ء میں یہ تحریک پھر سر اُٹھاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ کیونکہ افغانستان کے انگریز دشمن جماعت کے ایک نہایت طاقتور رکن نے متعصب ہندستانیوں کی مالی امداد اور ہمّت افزائی شروع کردی۔

(۳) کابل کو طلبا کے مشن کی اہمیت:

یہ تھی وہ جماعت جس کے احیا کی جھلک فروری ۱۹۱۵ء میں پنجابی طالب علموں کے فرار کے واقعہ میں دکھائی دی۔ اس وقت اس معاملہ کی تیزی سے انکوائری نہیں کی گئی کیونکہ یہ بات اُس وقت کی پالیسی سے ہم آہنگ نہ تھی کہ مسلمانوں کے معاملات میں ایسے نازک موقع پر اتنی گہرائی میں جا کر تحقیقات کی جائے چند لوگوں کے بارے میں یقین ہوگیا کہ انھوں نے اس مہم میں عملاً مدد کی ہے ان کو نظر بند بند کر دیا گیا۔ لیکن اتنی گہرائی تک تحقیق نہ کی گئی۔ جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ یہ مہم وہابیوں کی اپنی کوشش تھی یا کسی دوسرے سازشی نے وہابیوں کی جماعت کی اس باقیات کو باغیانہ اور اتحاد اسلامی کے مقاصد کے لیے بالقصد استعمال کرنے کی کوشش کی۔

(۴) مولوی عبیداللہ تحریک کا سربراہ:

ابھی حال ہی میں اس امر کا پتہ چلا ہے کہ آخری بات درست ہے اور یہ کہ طالب علموں کی ہجرت کا محرک اصلی مولوی عبیداللہ ہے جس نے کلکتہ کے ابوالکلام کی رضا مندی اور تعاون سے جو اتحاد اسلامی کا حامی مولوی ہے نیز کچھ اور وہابی لیڈروں کی مدد سے اس مہم کو چلایا ہے اور اُس کے مصارف برداشت کیے ہیں۔

مولوی عبیداللہ نو مسلم سکھ پنجابی ہیں انھوں نے دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور یو۔ پی میں تعلیم پائی ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے بارہ برس سندھ میں گزارے۔ جہاں وہ بہت بااثر ہوگئے تھے اور انھوں نے جنونی جذبات رکھنے والوں کے لیے مدرسہ قائم کیا تھا۔ پھر وہ دیوبند میں اُستاد بن کر واپس آئے اور انھوں نے جمعیۃ الانصار قائم کی۔ یہ دیوبند کے پرانے طالب علموں کی انجمن تھی۔ بظاہر یہ بالکل بے ضرر تھی۔ لیکن اس کے مقاصد جیسا کہ اب واضح ہوا ہے باغیانہ تھے۔

مولوی عبیداللّٰہ نو مسلم سکھ پنجابی ہیں انہوں نے دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور یو۔ پی میں تعلیم پائی ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہوں نے بارہ برس سندھ میں گزارے۔ جہاں وہ بہت بااثر ہوگئے تھے اور انہوں نے جنونی جذبات رکھنے والوں کے لیے مدرسہ قائم کیا تھا۔ پھر وہ دیوبند میں اُستاد بن کر واپس آئے اور انہوں نے جمعیۃ الانصار قائم کی۔

دارالعلوم دیوبند میں ایک استاد کی حیثیت سے مولوی عبیداللہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ کئی اساتذہ کی وفاداری کو متاثر کیا، جن میں خصوصیت سے مولانا محمود الحسن صدر مدرس شامل ہیں۔ وہ نہایت بااثر عالم ہیں۔ اس معاملہ میں آگے پھر ان کا ذکر آئے گا۔

اساتذہ میں اختلاف کے باعث بالآخر مولوی عبیداللہ کو برطرف کر دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ دلی میں متوطن ہوگئے اور ترکوں کے مشہور حامی۔ رام پور کے مولانا محمد علی مدیر کامریڈ کے گہرے دوست بن گئے۔

عبیداللہ نے دلّی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے عربی کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ حالیہ تحقیقات سے ظاہر ہوا ہے کہ اس کے قیام کا مقصداً سے اتحاد اسلامی کی سازش کا ہیڈ کوارٹر بنانا تھا۔

(۵) آزاد علاقہ کو مولوی سیف الرحمن کا مشن:

آیئے اصل واقعات کی طرف لوٹیں جون ۱۹۱۵ء میں مولوی سیف الرحمٰن جو فتح پوری مسجد میں استاد تھے اچانک غائب ہوگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شمالی مغربی سرحد کو عبور کر کے آزاد علاقہ میں پہنچ گئے ہیں۔

وہ فوراً حاجی صاحب ترنگ زئی سے وابستہ ہوگئے وہ ضلع پشاور کا ایک پُر جوش لیکن بااثر کٹر متعصب ہندستانی تھا۔ اور ہجرت کر کے آزاد علاقہ میں آ گیا تھا۔

اس نے حاجی صاحب کو مجبور کیا کہ علم جہاد بلند کرنے کی ان تھک کوشش میں سرحد کا دورہ کریں۔ وہ کامیاب رہا۔ اس کا ثبوت ان واقعات سے مل گیا۔ جن کے نتیجہ میں ۱۵/اگست ۱۹۱۵ء کو رستم کے مقام پر جنگ ہوئی۔ جس میں کئی متعصب ہندستانی کام آئے۔

اس کے بعد ہماری سرحدوں پر رہنے والے قبائل کے بے چینی اور شورشیں بھی حاجی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ اس وقت یہ بات معلوم نہ تھی لیکن بعد میں اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ کہ سیف الرحمٰن کے مشن کی ذمہ داری بھی عبیداللہ پر ہے۔ یہ اس کی سازش کا ایک لازمی حصّہ تھا۔

مولوی عبیداللہ کا فرارِ کابل

کابل میں ہندستانیوں کی سازشیں اگست ۱۹۱۵ء اور بعد کے واقعات:

اسی ماہ یعنی جون ۱۹۱۵ء سے سرکاری کاغذات سے مولوی عبیداللہ کا

کچھ پتہ نہیں چلتا اس کے بعد سے انھیں برطانوی ہند میں نہیں دیکھا گیا۔

اب معلوم ہوا ہے کہ سندھ میں چند ماہ کے قیام میں انھوں نے اپنے پُرانے روابط کو تازہ کیا۔ اپنے باغی دوستوں سے صلاح ومشورہ کیا اور ان سے خط وکتابت کے طریقے متعین کیے اور اس کے بعد اپنے حلیفوں کے ہمراہ براہ کوئٹہ وقندھار کابل کو روانہ ہوگئے۔ ۱۸ر اکتوبر کو وہ کابل پہنچے اور لاہوری طلبا کو پیرا جو اس وقت کابل پہنچ چکے تھے اور ترک جرمن مشن سے جس کے سرغنہ دو غدار ہندستانی مہندر پرتاب اور برکت اللہ تھے اِن سے وہ جا کر مل گئے۔ مہندر پرتاب اور برکت اللہ نے براہِ برلن وقسطنطنیہ کابل کا سفر کیا تھا۔ وہ قیصر جرمنی اور سلطان ترکی کے خطوط لائے تھے کہ افغانستان کو ہندستان پر حملہ کے لیے آمادہ کرسکیں۔ کابل میں ہندستانی سازشوں نیز سردار نصراللہ خاں اور افغانستان میں جنگ کے حامی عناصر کے درمیان کئی بار صلاح ومشورہ ہوا۔

روسی ترکستان قسطنطنیہ اور برلن کو برطانیہ کے خلاف مشن روانہ کئے گئے کابل میں موجود ہندستانی سازشوں اور ہندستان میں موجود ان کے مشیروں کے درمیان بہت کافی خط وکتابت ہوئی جس کا نقطۂ عروج اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کا پکڑا جانا ہے۔ جو ایک لاہوری طالب علم کے پاس سے برآمد ہوئے جو قاصد کا کام کررہا تھا۔

(۶) مولوی محمود حسن کا حجاز کو مشن ستمبر ۱۹۱۵ء:

دریں اثنا دیوبند کے ممتاز مولویوں کی دو جماعتیں ستمبر ۱۹۱۵ء میں حجاز کے لیے روانہ ہوئیں۔ یہ عام طور پر افواہ تھی کہ ان کا ارادہ ہجرت کرنے کا ہے۔ اور مخالف حکومت جذبہ نے ان کو اس اقدام پر آمادہ کیا ہے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ وہ حجاز میں چند خاص ترک افسروں سے ملاقات کریں گے لیکن بروقت کوئی ایسی اطلاع نہیں مل سکی جس سے ان کو ہندستان ہی میں روکا جاسکے۔

بمبئی میں گرمجوشی سے رخصت کئے جانے کے بعد یہ دونوں جماعتیں ستمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی سے روانہ ہوگئیں مولوی خلیل احمد اور اُن کی پارٹی ۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو اور مولانا محمود حسن اور اُن کی پارٹی ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو روانہ ہوئیں۔

۱۹۱۵ء کے موسم خزاں میں اور ۱۹۱۶ء کے موسم بہار میں اِن پارٹیوں کے بعض اراکین ہندستان لوٹ آئے۔ لیکن جب تک کہ ریشمی خطوط کے ذریعہ ہمیں عبیداللہ کی سازش اور محمود حسن کے اس سے تعلق کے بارہ میں قابلِ اطمینان واقفیت حاصل نہ ہوئی۔ ان میں سے کسی سے پوچھ تاچھ نہیں کی گئی۔

(۷) ساری سازش کا انکشاف ریشمی خطوط کے ذریعہ ہوا:

اس سازش کے اراکین کو 'جنود ربانیہ' (خدائی فوج) نام دیا گیا تھا۔ اس کے تمام اراکین کو فوجی عہدے دینا اور مدینہ کو اس کا خاص مرکز بنانا طے پایا تھا۔ جہاں دیوبند کے مولوی محمود حسن کو القائد یا جنرل مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے ثانوی مراکز استنبول، تہران اور کابل تھے۔ کابل میں مولوی عبیداللہ کو قائم مقام جنرل مقرر کیا گیا تھا۔

دریں اثنا دیوبند کے ممتاز مولویوں کی دوجماعتیں ستمبر ۱۹۱۵ء میں حجاز کے لیے روانہ ہوئیں۔ یہ عام طور پر افواہ تھی کہ ان کا ارادہ ہجرت کرنے کا ہے۔ اور مخالف حکومت جذبہ نے ان کو اس اقدام پر آمادہ کیا ہے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ وہ حجاز میں چند خاص ترک افسروں سے ملاقات کریں گے لیکن بروقت کوئی ایسی اطلاع نہیں مل سکی جس سے ان کو ہندستان ہی میں روکا جاسکے۔

اس فوج کا مقصد کافروں کے تحتِ حکومت ممالک اسلامیہ بالخصوص ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے سلاطین اسلامیہ کو متحد کرنا تھا۔ مولوی محمود حسن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ حجاز کے ذریعہ خلافت عثمانیہ سے رابطہ قائم کریں اور اس حکومت کو چند شرطیں ماننے پر آمادہ کریں۔ جن کے پورے ہونے پر حکومت افغانستان، برطانیہ سے برسرِ جنگ ہوجائے گی۔ اس فوج کے جو افسران کابل میں تھے ان کے ذمہ تھا کہ وہ بھی اسی مقصد کے لیے افغانستان کے انٹی برٹش عناصر سے جوڑ توڑ کرتے رہیں اور آزاد قبائل میں برطانیہ کے خلاف ہر وقت عداوت اور دشمنی کے جذبات کو مشتعل کرتے رہیں۔

ہندستان میں جو سازشی موجود تھے۔ ان کا کام (غالباً پُرانی وہابی تحریک کے ذریعہ) روپیہ جمع کرنا تھا تاکہ کابل ہندستان اور حجاز میں سازش کے مصارف پورے ہوسکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں ہندستانی مسلمانوں میں مذہبی جنون کو اتنا زیادہ بڑھا دینا تھا کہ افغانستان اور ہندستان کے درمیان جنگ چھڑتے ہی وہ بھڑک کر ہر طرف آگ

لگادیں۔

اس فوج کے افسروں کی ایک فہرست خطوط کے ساتھ منسلک تھی۔ جس سے ظاہر ہوگیا کہ سازش کی ہدایت کرنے والی طاقت عبیداللہ کی تھی۔اس فوج کے افسران واضح طور پر چارگروپوں میں منقسم تھے۔

(۱) عبیداللہ کے کٹّر متعصب جنونی دوست، پیرو اور رشتہ دار جو سندھ میں تھے اور اُن کے رابطے ہندستان کے سب حصوں میں تھے۔

(۲) دیوبند(سہارنپور)اوردلّی کے مولویوں کا گروپ جنھیں عبیداللہ نے جب وہ دارالعلوم دیوبند میں اُستادتھا۔نیز جمعیۃ الانصاراور نظارۃ المعارف القرآنیہ سے تعلّق کی بناپر اپنے اثر میں لے لیاتھا۔

(۳) بہار، یوپی، پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے وہابی جو چندہ جمع کیا کرتے تھے۔

(۴) اتحاد اسلامی کے حامی مشہور لیڈر۔جنود ربانیہ کی اسکیم ایک اور جماعت سے مربوط تھی جسے حکومت موقتۃ ہندیہ کہا جاتا تھا۔جس کے کارکنوں کے لیے مسلمان ہونا لازم نہ تھا راجہ مہندر پرتاب اس کے صدر تھے۔ وزیر اعظم مولوی برکت اللہ اور وزیر امور ہند مولوی عبیداللہ تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کا مقصد تھا ہند اور افغانستان میں تصادم اور افغانستان میں جو غیر مطمئن ہندستانی تھے اِن کے وفود کو غیر جانب دار یا دُشمن مما لک میں بھیج کر جوڑتوڑ اور سازباز کرنا۔

مختصر یہ کہ عبیداللہ کی اسکیم یہ تھی کہ ہندستان میں اسلامی عسکریت کی سوکھی ہڈیوں میں سے جن اجسام میں زندگی کی رمق باقی ہے۔اُن سے کام لیا جائے۔اس طرح اس نے اپنی سازش میں وہابی تحریک کی باعمل مشینری مولوی طبقہ کا اسلامی جوش وجذبہ اور اتحادِ اسلامی کے حامیوں کی سیاسی توانائی اور تلخی کو یکجا کردیا تھا۔

اس کا مزید منصوبہ یہ تھا کہ ایک دوسری سازشی جماعت (یعنی حکومت موقتۃ ہند) کے پہلو بہ پہلو کام کیا جائے تا کہ ہندوؤں کے انقلاب پسند عناصر اس کی جانب رہیں۔

(۸) حجاز میں مولوی محمود حسن کی سرگرمیاں:

اُن خطوط کے برآمد ہونے سے جو مدینہ طیبہ میں مولوی محمود حسن کے نام تھے۔مولوی محمود حسن کی ہر پارٹی کے ان لوگوں کے خلاف تحقیقات شروع ہوئی جو واپس آچکے تھے۔ان کے بیانات سے ہمیں حجاز میں مولوی محمود حسن کی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ ہوا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روانگی کے وقت بجز اس کے اور کچھ پیشِ نظر نہ تھا کہ ہمدردی رکھنے والے ترک افسروں سے ملاقات اور جوڑ توڑ کرکے ہندستان کے خلاف یا افغانستان کی مدد کے لیے فوج بھجوانی ہے کہ وہ ہم پر حملہ کرسکے۔

اس کی اور خلیل احمد کی جماعتیں حجاز میں باہم مل گئیں۔لیکن اس بات کا یقین نہیں کہ کیا مولوی خلیل احمد سازشیوں کے اندرونی رازوں سے واقف تھا اور نہ اس بات کا کہ کیا دونوں جماعتوں کے اراکین مساوی طور پر سازش میں ملوث تھے۔

محمود حسن نے حجاز کے والی غالب پاشا سے یقیناً غدارانہ سازباز کی لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آخرالذکر نے اس مہم میں اُس کی کچھ زیادہ ہمّت افزائی کی۔غالب پاشا نے کہا کہ ترک دوسرے قصوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔اور وہ نہ تو افغانستان کو مدد بھیج سکتے ہیں اور نہ ہندستان کو لشکر روانہ کرسکتے ہیں۔

تاہم انھوں نے مولانا کو ایک فرمان جہاد دے دیا جسے مولوی محمد میاں نے ہندستان پہنچادیا۔وہ اس جماعت میں شامل تھے جو جنوری ۱۹۱۵ء میں ہندستان لوٹی تھی کہا جاتا ہے کہ آزاد علاقہ کے کٹّر متعصب قبائل کو ہمارے خلاف مقابلہ میں لانے کے لیے اُسے بڑے مؤثر طریقہ پر استعمال کیا گیا۔اس کی نقلیں کرکے ہندستان میں بھی تقسیم کی گئی تھیں۔

یقین کیا جاتا ہے کہ مولوی محمود حسن اور مولوی خلیل احمد دونوں نے ۱۹۱۶ء میں کسی وقت حجاز میں جمال بے اور انور بے سے ملاقات کی تھی۔ لیکن ان ملاقاتوں کے بارہ میں کسی اور تفصیل کا علم نہیں۔مولوی خلیل احمد ستمبر ۱۹۱۶ء میں ہندستان واپس آگئے جبکہ مولوی محمود حسن اور اُن کی جماعت کے چند منتخب اراکین حجاز ہی میں ٹھہرے رہے اور شاید اب بھی مدینہ میں ہیں۔

کسی وقت مولوی محمود حسن کو خیال ہوا تھا کہ وہ حجاز سے قسطنطنیہ جائے۔لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس نے اپنا ارادہ پورا کرلیا ہو۔ابھی حال ہی تک وہ مکہ میں تھا۔

دستخط

وی۔وی۔ویان

□□

اشتہار

مدرسہ فیضانِ رحیمی مرزاپور پول

تحریک ریشمی رومال ایک تعارف

مفتی محمد سلمان منصورپوری (مدرسہ شاہی مرادآباد)

نوٹ: اس مقالہ میں تحریک شیخ الہند سے متعلق حصہ، راقم الحروف نے جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام منعقدہ ''شیخ الہند سیمینار'' (بتاریخ یکم جنوری ۱۹۸۶ء) میں پیش کیا تھا، اس وقت احقر دارالعلوم دیوبند میں درجۂ ششم عربی کا طالب علم تھا۔ غالباً یہ احقر کا پہلا تحقیقی مقالہ تھا، جسے سیمینار کی دوسری نشست (منعقدہ مدنی ہال دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی) میں ہندوپاک کے اہم علماء واکابر کے مجمع میں پڑھ کر سنایا گیا، اور بحمدہ تعالیٰ حضرات سامعین نے توقع سے زیادہ حوصلہ افزائی اور پذیرائی سے نوازا، بالخصوص محسن ومشفق بزرگ اور باذوق مؤرخ ومحقق حضرت مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی نوراللہ مرقدہ نے توجہ سے سن کر اظہار مسرت فرمایا اور دلی دعاؤں سے سرفراز کیا، فجزاہم اللہ احسن الجزاء، بعد میں یہ مضمون متعدد رسائل میں شائع ہوا، پاکستان کے بعض احباب نے اسے الگ کتابچہ کی شکل میں بھی شائع کیا۔ اب یہ مضمون اپنے قارئین کے استفادہ کے لیے 'تحریک ریشمی رومال نمبر' میں پیش کیا جارہا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ (مرتب)

استاذ الاساتذہ شیخ العالم، عارف باللہ، بطل حریت، مجاہد جلیل، شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نوراللہ مرقدہ (م ۱۳۳۹ھ) کا نام نامی جب لیا جاتا ہے تو یکا یک قلب ودماغ میں جھری جھری سی آتی ہے اور غیر شعوری طور پر ایک ان جانے جوش سے بدن کا رُواں رُواں سرشار ہوجاتا ہے۔ یہ اثر ہے اس عظیم محسن قوم وملت کے بے نظیر جوش عمل، اور اس مرد مجاہد کے بے مثال تدبر کا، جس کے کارناموں کے ان مٹ نقوش ہندستان کی اسلامی تاریخ میں نیرّ تاباں بن کر چمکتے رہیں گے، جس کا علمی اور روحانی فیض پوری قوت کے ساتھ انشاء اللہ تاقیامت جاری رہے گا اور جس کے بلند پایہ خیالات اور وطنی ودینی جذبات سے آنے والی نسلیں برابر مستفیض ہوکر اپنی کامیاب زندگی کے خطوط متعین کرتی رہیں گی۔

ولادت اور تعلیم:

حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ء (۱۸۵۱ء) میں بریلی میں ہوئی، جہاں آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، چھ سال کی عمر میں دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت میاں جی بنگلوریؒ کے پاس تعلیم کا آغاز فرمایا، اس کے بعد عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں میانجی عبداللطیف اور مولوی مہتاب علی سے پڑھیں، حسن اتفاق کہ ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو دیوبند کی چھتہ مسجد میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا جس کے اولین اساتذہ میں صاحب معرفت بزرگ ملا محمود دیوبندیؒ اور ان کے اولین شاگردوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ شامل تھے۔ اسی سال استاذ الاساتذہ جامع العلوم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ بھی یہاں رونق افروز ہوگئے اور ایک عظیم چشمۂ روحانی سرزمین دیوبند سے جاری ہوگیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اسی علمی اور روحانی ماحول میں پروان چڑھنے لگے۔

استاذ اعظم کی خدمت میں:

۱۲۸۶ھ میں آپ نے اپنے عظیم ترین استاذ اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں صحاح ستہ کا آغاز فرمایا اس وقت حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے پھر بعد میں دہلی منتقل ہوگئے اور اس دوران دیوبند اور نانوتہ بھی بکثرت آمد ورفت رہی، حضرت شیخ الہندؒ علم کی طلب اور استاذ کی خدمت کی غرض سے سفر وحضر میں استاذ مکرم کے ساتھ رہنے لگے اور اپنی پوری زندگی اور زندگی کی سب چاہتیں اپنے نابغۂ روزگار استاذ پر نچھاور کردیں، آپ کی کمالِ سعادت مندی، نیازمندی اور جاں سپاری کی بدولت آپ کو استاذ مکرم کی طرف سے ایسی شفقتیں اور عنایتیں نصیب ہوئیں کہ آپ اس معاملہ میں اپنے تمام ہم عصروں پر سبقت لے گئے اور حضرت حجۃ الاسلامؒ کے علمی وروحانی فیض کی اشاعت کا بڑا ذریعہ قدرت خداوندی نے آپ ہی کو بنادیا، حضرت شیخ الہندؒ نے استاذ معظم حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ سے محض علوم دینیہ ہی میں شرف تلمذ حاصل نہیں کیا تھا، بلکہ آپ نے اپنے دل میں استاذ کے سینہ میں لگی ہوئی وہ آگ بھی سلگالی تھی جس نے انہیں ۱۸۵۷ء میں شاملی کے میدان میں سربکف ہوکر انگریز دشمن کا مقابلہ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ گویا کہ یوں کہئے کہ ''قاسم'' نے جب مئے عرفان ومحبت تقسیم کی تو ''محمود'' نے اپنے دامن کو آئینہ بنا کر ساقی کی صورت وسیرت حتی کہ اس کے ارادے اور عزائم بھی اپنے اندر جذب کرلیے، اب قاسم

محمود الگ الگ نہیں رہے، بلکہ ایک جان دو قالب بن گئے۔ جو ''قاسم'' سوچتے وہی ''محمود'' کا مطمحِ نظر ہوتا، اور جو ''محمود'' منصوبہ بناتے وہ ''قاسم'' ہی کی ترجمانی ہوتی تھی۔ جس کا کچھ اندازہ آپ کی سیاسی واصلاحی تحریکات سے لگایا جاسکتا ہے۔

فیضان علمی:

۱۲۸۹ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس کے طور پر تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا، ۱۲۹۰ء میں منعقد ہونے والے پہلے عظیم الشان جلسہ دستار بندی میں وقت کے اکابر و معظم علماء کے ذریعہ آپ کو دستار فضیلت عطا ہوئی، ۱۲۹۲ء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کا باقاعدہ مدرس بنایا گیا، اور اگلے ہی سال (۱۲۹۳ء) سے آپ نے دورۂ حدیث شریف کی اعلیٰ کتابوں کا درس دینا شروع فرمادیا جو متواتر ۴۴؍سال تک جاری رہا۔ اور اس دوران سینکڑوں تشنگانِ علوم نبوت نے آپ سے استفادہ کیا اور پورے برصغیر میں آپ کی شہرت وقابلیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ ۱۳۰۵ء سے تاحیات یعنی ۳۴؍سال تک آپ نے دارالعلوم کی بلند پایہ صدارت تدریس کو بھی زینت بخشی، جو بجائے خود ایک امتیاز ہے۔

آپ کا درس اپنی نرالی شان رکھتا تھا، علوم نبوت کا وہ فیضان تھا کہ الفاظ ان کا بیان کرنے سے عاجز تھے۔ جس مسئلہ پر گفتگو شروع ہوجاتی لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مبدأ فیاض نے آپ کا سینہ علم ومعرفت کے لیے کھول دیا تھا۔ علماء کے اقوال کی توجیہات، متعارض نصوص میں تطبیق، مسلک حقہ کی تائید اس انداز میں فرماتے کہ ہر شخص مطمئن ہوجاتا، خود آپ کے اکابر اور اساتذہ کو بھی آپ کے علم کا اعتراف تھا چناں چہ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور امام ربانی حضرت گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ ''مولوی محمود حسن علم کا کٹھلا ہیں''، یعنی ان کے رگ وپے میں علوم نبوت رچ اور بس گئے ہیں۔

سلوک ومعرفت:

ایک طرف یہ علمی تبحر تھا اور دوسری طرف آپ سلوک معرفت میں بھی اپنے وقت کے امام تھے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۲۹۴ھ میں جب آپ نے اپنے استاذ معظم حضرت نانوتویؒ کے ہمراہ پہلی مرتبہ حج مبرور کی سعادت حاصل فرمائی تو مکہ معظّمہ میں سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف حاصل کیا اور حضرت حاجی صاحبؒ نے اسی سفر میں آپ کو خلافت واجازت سے بھی مشرف فرمادیا، اسی نسبت خاصہ کا اثر تھا کہ آپ کی پوری حیات طیبہ اتباع سنت مبارکہ سے عبارت تھی۔ تواضع وعاجزی کمال درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ تمام تر کمالات علمیہ وعملیہ اور وجاہت وقبولیت کے باوجود کوئی شخص آپ کی ظاہری کیفیت دیکھ کر آپ کے مقام ومنصب کا اندازہ نہیں لگاسکتا تھا۔ ذوق اطاعت اور شوق عبادت ایسا تھا کہ آپ کے معمولات دیکھ کر جوانوں کو شرم آجاتی۔ گفتگو میں متانت، نرمی اور سنجیدگی غالب تھی۔ اور دل میں نصیحت وخیر خواہی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے مردم شناسی اور افراد سازی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اسی کمال کا نتیجہ تھا کہ آپ کے شاگردوں کے ذریعہ پورا عالم علم حدیث کی روشنی سے منور ہوگیا۔ آج جدھر نظر ڈالیے شیخ الہند کے شاگردوں کا طوطی بولتا نظر آتا ہے۔ محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (جو بکمال ادب اپنے استاذ معظم کو ''شیخ الہندؒ'' کے بجائے ''شیخ العالَم'' کے لقب سے یاد فرماتے تھے) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ، شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ وغیرہ جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرکے ہی یہ مقام حاصل کیا ہے۔ سچ ہے:

ایں سعادت بزور طاقت نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تحریک شیخ الہند:

علم وعمل کی مسند سجانے اور اشاعت علوم نبوت کے میدان میں اپنا لوہا منوانے کے ساتھ ساتھ شیخ الہندؒ احوال زمانہ سے بھی کبھی غافل نہیں رہے بلکہ انہوں نے دیوبند کی چٹائیوں پر بیٹھ کر پورے عالم کے حالات پر نظر رکھی۔ لوگوں کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ زاہد فی الدنیا بزرگ جس کی ظاہری زندگی مسجد اور مدرسہ تک محدود ہے۔ اور جس کا منحنی سا وجود علوم نبوت کے لعل وجواہر ڈھونڈنے میں ہمہ وقت مشغول ہے، کیا وہ کسی بین الاقوامی تحریک کی قیادت بھی کرسکتا ہے؟ اور کیا وہ ایسی حکومت کی بنیادیں، ہلانے کی بھی طاقت رکھتا ہے؟ جس کی حکومت میں اس دور میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا؟ یہ بات شاید کسی کے وہم وخیال میں بھی نہ گذرتی ہوگی، مگر آگے جاکر وقت نے بتادیا کہ یہی مجاہد استاد کا مجاہد شاگرد ''محمود حسن'' تھا جو دسیوں سال دیوبند میں بیٹھ کر خلافت عثمانیہ کے

خلاف انگریزی ریشہ دوانیوں، بلقان وطرابلس کی خوں چکاں داستانوں، اور عالم عرب پر انگریزی چیرہ دستیوں پر کرب کی حالت میں راتوں کو کروٹیں بدلتا رہا، اور جس نے بالآخر ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے عالم اسلام کو انگریز سے نجات دلانے کے لیے ایک تحریک کا منصوبہ بنایا جسے بعد میں ''تحریک شیخ الہند'' یا ''تحریک ریشمی رومال'' کے نام سے جانا گیا۔ یہ تحریک کیا تھی؟ کہاں سے شروع ہوئی؟ کن کن مراحل سے گذری؟ اور پھر اس کا کیا انجام ہوا؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب درج ذیل مضمون میں دینے کی کوشش کی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔ (حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیل حالات کے لیے ''حیات شیخ الہندؒ'' مؤلفہ حضرت مولانا سید اصغر علی صاحبؒ اور نقش حیات جلد دوم مؤلفہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا مطالعہ کیا جائے)

دار العلوم دیوبند کے قیام کا مقصد:

لوگ کہتے تھے کہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۷ء) میں دیوبند میں قائم ہونے والا دار العلوم ایک خالص دینی و مذہبی مدرسہ ہے۔ مگر شیخ الہندؒ کی سوچ سب سے الگ تھی، ان کے سامنے جب دار العلوم کو صرف مرکز تعلیم وتعلم کے بطور پیش کیا جاتا تو ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی، صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا، اور بے اختیار اصل حقیقت زبان پر آجاتی، ایک مرتبہ آپ کے شاگرد رشید مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے آپ کے سیاسی مسلک کے بارے میں سوال کیا، اس پر آپ کا ردعمل کیا تھا؟ خود مولانا گیلانیؒ کی زبانی سنئے:

''اپنی بات جب ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے۔ اور اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دار العلوم جن کو وہ ''حضرت الاستاذ'' کے لقب سے یاد کرتے تھے انہی کا نام لیکر فرمایا ''کہ حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا (صرف) درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی تلافی کی جا سکے'' پھر ارشاد ہوا: ''تعلیم وتعلم جن کا مقصد اور نصب العین ہے ان کی راہ میں میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لیے اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے دار العلوم کا نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذؒ نے قائم کیا تھا۔'' (دار العلوم میں بیتے ہوئے دن ''مولانا گیلانی''، ماہنامہ دار العلوم دیوبند جمادی الثانیہ ۱۳۷۳ھ)

یہی وہ نظریات وخیالات تھے جن کی بنا پر حضرت شیخ الہندؒ نے ہندستان کو غلامی سے نجات دلانے اور اس ملک میں اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لیے ایک ہمہ گیر انقلابی تحریک کا منصوبہ بنایا، اور ظاہری اسباب ووسائل نہ ہونے کے باوجود خدمت دین وطن کے لیے جدوجہد شروع کردی۔

انجمن ثمرة التربیت:

ابھی دار العلوم کے قیام پر ایک دہائی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں اس عظیم مرکز کے سب سے پہلے فرزند جلیل مولانا محمود الحسنؒ نے اپنے رفقاء کی اعانت اور اپنے استاذ جلیل مجاہد حریت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ایما پر ''سالانہ چندہ دہندگان'' کے عنوان سے ایک انجمن قائم کی جس کا نام ''ثمرۃ التربیت'' تجویز کیا گیا، اس جمعیۃ عظمیٰ میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ اٹھارہ اور مرکزی ارکان تھے، جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں (۱) مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ (۲) مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ (۳) مولانا عبد الحق صاحب پرقاضویؒ (۴) مولوی محمد فاضل صاحب ساکن پھلتؒ (۵) مولوی میر محمد صادق صاحب مدراسیؒ (۶) مولوی عبد القادر صاحب دیوبندیؒ (۷) مولوی فتح محمد صاحب تھانویؒ (۸) مولانا عبد اللہ صاحب انبیٹھویؒ (۹) مولانا محمد مراد صاحبؒ ساکن پاک پٹن (۱۰) مولانا عبد اللہ صاحب گوالپاڑیؒ (۱۱) مولانا عبد العلی عبد اللہ پوری میرٹھیؒ (۱۲) مولانا نہال احمد صاحب دیوبندیؒ (۱۳) مولوی عبد اللطیف صاحب سہسپوری (۱۴) مولوی عبد اللہ صاحب جلال آبادیؒ (۱۵) مولوی محمد اعلیٰ صاحب انبیٹھوی (۱۶) مولوی محمد عبد العدل صاحب پھلتی (۱۷) مولانا کوثر صاحب نگینویؒ (۱۸) مولانا کرامت اللہ صاحب دہلویؒ۔ (پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی الرشید دار العلوم نمبر ۲۸۲/۲۸۳)

اس انجمن کا مقصد اصلی کیا تھا؟ اس سلسلہ میں مؤرخ تحریک آزادی حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کا یہ تجزیہ لائق مطالعہ ہے، مولانا انجمن کے مقاصد پر چند قرائن ذکر کرکے تحریر فرماتے ہیں: ''بہر حال اس پس منظر کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ ثمرۃ التربیت سے صرف فضلا ومنتسبین دار العلوم کی تنظیم مقصود نہیں تھی؛ بلکہ در اصل مقصد ایسے باحوصلہ افراد کی تنظیم تھا جو قیام دار العلوم کے مقصد ۱۸۵۷ء کی تلافی کے سلسلے میں کام کرسکیں۔'' (اسیران مالٹا ۱۲)

لیکن افسوس کہ اس عظیم انجمن کے قیام کے چند ہی دنوں بعد ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پچاس سال سے بھی کم عمر میں اس دار

فانی سے رحلت فرما گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور ثمرۃ التربیت کی تمام تر ذمہ داری آپ کے عظیم ترین شاگرد ارشد مستقبل کے شیخ الہند پر آپڑی، چنانچہ اس تلمیذ رشید نے اپنے استاذ اجل کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد شروع کردی اس کے بعد متواتر تیس برس تک آزادی کے متوالوں اور ملت اسلامیہ کے نام لیواؤں کی یہ خفیہ انجمن نہایت رازداری کے ساتھ اپنے مقصد حقیقی کی طرف گامزن رہی اور ان منتخب افراد کے سینوں میں جذبات حریت بھڑکاتی رہی جن کے قلوب روح ایمانی سے معطر اور بدن جذبۂ شہادت سے سرشار تھے، اس انجمن کی سرگرمیاں اگرچہ ہندستان میں رکی ہوئی نظر آتی تھیں لیکن قبائلی علاقوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے جاں نثار شاگردوں کے ذریعہ یہ تحریک نہایت رازداری کے ساتھ سرگرم عمل تھی، اور تحریک کے روحِ رواں حضرت شیخ الہندؒ ان علاقوں سے برابر رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ (تجزیہ مولانا محمد میاں صاحب اسیرانِ مالٹا ۲۵)

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۳۱۵ھ نے اپنے لائق ترین شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو جو ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہوکر اپنے وطن لوٹ گئے تھے دیوبند طلب فرمایا اور اس وقت کے حالات کے پیش نظر علمی کام کے ساتھ ساتھ سیاسی کام کرنے کی بھی تلقین فرمائی اور ان کو اپنی تحریک کا ایک اہم رکن منتخب کرلیا، اس کے بعد مولانا سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کا سیاسی پروگرام لے کر اپنے وطن پہنچے اور اپنی عملی زندگی کا آغاز گوٹھ پیر جھنڈا حیدرآباد میں ''دارالرشاد'' نامی ایک مدرسہ کے قیام سے کیا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں سندھ کے گردونواح میں آزادی ہند کے لیے مخفی طریقہ سے کام جاری تھا، جس کی قیادت سرزمین سندھ کے عظیم المرتبت بزرگ خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ فرما رہے تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی اس تحریک سے منسلک ہوگئے تھے کیونکہ حضرت دین پوریؒ آپ کے پیرومرشد بھی تھے، لیکن ۱۳۱۵ھ کے بعد جب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا تعلق ''تحریک شیخ الہند'' سے ہوا، تو انھوں نے سندھی تحریک کو ''تحریک شیخ الہند'' کے ساتھ مربوط کرکے حضرت شیخ الہندؒ کو زبردست سیاسی قوت سے ہم کنار کیا، حضرت دین پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے درمیان تعلق پیدا کرنے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے عظیم الشان رول ادا کیا۔ (''ید بیضا'' حامی عبیدی)

قیام سندھ کے زمانہ میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحبؒ کا خفیہ رابطہ برابر دیوبند سے رہا اور حضرت شیخ الہندؒ سے برابر مشورہ لیتے رہے، حتی کہ ایک مرتبہ اپنے مدرسہ میں امتحان لینے کے بہانے سے حضرت شیخ الہندؒ کو سندھ کا دورہ کرایا اور یہاں پر ہونے والے کام سے متعارف کرایا۔ (داستان خانوادہ مولانا احمد علیؒ: ۵۸/عبدالرؤف ملک، ید بیضا، ص: ۸۳/علاوہ ازیں نقش حیات: ۱۹۶/۲، میں حضرتؒ کے امروٹ، سندھ جانے کا تذکرہ ہے)

جمعیۃ الانصار:

اس کے بعد اس جماعت کا ظہور ''جمعیۃ الانصار'' کے نام سے (۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء) میں ہوا یہ اصل میں ''انجمن ثمرۃ التربیت'' ہی کا ایک نیا لیبل اور عنوان تھا، جس کی تائید مولانا محمد میاںؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے:

''۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ھ کا ہنگامہ خیز دور جس میں بقول سرونیزل انیٹس گورنر پنجاب، ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے موقع تھے، ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی وہ منتظر تھے کہ اس تحریک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے،'' (یہ زمانہ) حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کی جماعت کے لیے ایک حیات بخش دور تھا جس کی تمہید خفیہ طور پر ستائیس سال پیشتر کی جاچکی (یعنی ثمرۃ التربیت کے قیام کے ذریعہ) چنانچہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں اس کو منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا گیا اور جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا جس کی مقبولیت بھی اسی طرح ہمہ گیر ہوئی۔'' (علمائے حق، ۱/۱۳۰/۳)

اس اہم ترین جماعت کی ادارت کی ذمہ داری حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو سندھ سے بلاکر سپرد کی، چنانچہ خود مولاناؒ ذاتی ڈائری صفحہ ۲۰ میں تحریر فرماتے ہیں: ''۱۳۲۷/۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا، چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔''

یہ تحریک یا تنظیم کیوں کہ عام لوگوں کے لیے جدید تھی اس لیے اس کو لوگوں میں متعارف کرانے کے لیے دارالعلوم کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسۂ دستاربندی کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا، یہ عظیم اجتماع ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوا جس میں تقریباً تیس ہزار افراد نے شرکت کی۔ (علمائے حق ۱/۱۳۱)

اس طرح کا اجتماع اس زمانہ میں کسی جماعت کو نصیب نہ ہوا تھا، اجتماع میں ہر طبقہ کے لوگوں نے شرکت کی ان میں ایک معتد بہ مقدار ان لوگوں کی تھی جو ثمرۃ التربیت کے قیام کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں شامل ہوگئے تھے، ان کو اس جلسہ کے ذریعہ مل بیٹھنے کا سنہرا موقعہ

ہاتھ آ گیا تھا چنانچہ اس عظیم الشان اجلاس میں سندھی تحریک آزادی کے قائدین خواجہ غلام محمد دین پوریؒ اور مولانا تاج محمود امروٹیؒ بھی شریک ہوئے تھے۔ (ید بیضا۱۰۷) اس کے علاوہ اس جلسہ سے جمعیۃ الانصار کا تعارف بھی بحیثیت تنظیم فضلاء دارالعلوم لوگوں میں ہو گیا تھا اس کے بعد اپریل ۱۹۱۱ء میں شہر مرادآباد میں جمعیۃ کا پہلا باقاعدہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا سید احمد حسنؒ نے فرمائی آپ نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں وضاحت کی کہ: ''بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نقل ہے، لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں، جمعیۃ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس سال پہلے شروع ہوگئی تھی اور اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور فنون کے آفتاب ہیں اور جن کی ذات بابرکات پر آج زمانہ جس قدر بھی ناز کرے کم ہے''۔ (علمائے حق ۱۳۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی ہمہ گیر اور منظّم تحریک کی ابتدا ثمرۃ التربیت سے کی تھی اور بعد میں از سرِ نو تنظیم کے لیے جمعیۃ الانصار نام تجویز کیا۔

جلسہ مرادآباد کے بعد جمعیۃ کے پانچ چھ جسے ملک کے مختلف حصوں میں ہوئے جن میں شملہ، میرٹھ، دیوبند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس جمعیۃ کے ذریعہ عوام سے رابطہ اور تعلق کی ایک صورت پیدا ہوئی، اور مسلم سیاست پر جو ایک عرصہ سے جمود طاری تھا اس میں کافی حد تک کمی آ گئی، تقریباً چار سال تک یہ انجمن باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتی رہی اور لوگوں پر اس تحریک کا مثبت اور مؤثر اثر رونما ہوا لیکن حکومت افرنگیہ کے کان بھی اس نئی تحریک کو دیکھ کر کھڑے ہونے لگے، کیوں کہ انگریز کو معلوم تھا کہ اس تنظیم کا قائد شیخ الہندؒ اس مجاہد دوراں کا تربیت یافتہ ہے جس نے شاملی کے میدان میں انگریزی فوج کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا تھا، اور حکومت وقت کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ اگر یہ تحریک چلتی رہی تو بہت جلد ہی انگریز کو ہندستان سے در بدر ہونا پڑے گا۔ یہ رپورٹیں حضرت شیخ الہندؒ اور دارالعلوم کے منتظمین کو پہنچ رہی تھیں جس کی بنا پر یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں جمعیۃ الانصار کی وجہ سے حکومت دارالعلوم کو نقصان پہنچا دے، اتفاق سے اس عرصہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ میں چند علمی مسائل میں اختلاف پیدا ہو گیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے ان اختلافات کو بنیاد بنا کر مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو دیوبند سے دہلی جانے کا حکم مرحمت فرمایا، اور جمعیۃ الانصار کی نظامت سے آپ سبک دوش ہو گئے۔ (نقش حیات ۲/۱۴۴)

نظارہ المعارف (القرآنیہ):

دہلی پہنچ کر حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے دینی تربیتی مرکز کی بنیاد رکھی، جس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہندؒ، ڈاکٹر انصاری اور نواب وقار الملک برابر کے شریک تھے۔ (نقش حیات ۲/۱۴۵)

یہ مدرسہ بقول حضرت مولانا محمد میاں صاحب دردمندان حریت کے لیے جائے اطمینان اور آزادی کے ساعیوں کے لیے خفیہ مشورہ گاہ تھا۔ (اسیران مالٹا۲۷) اس مدرسۂ آزادی میں طلبہ میں جذبات حریت کیسے پیدا کیے جاتے تھے؟ اس کی ایک جھلک مولانا شائق عثمانیؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''نظارۃ المعارف دہلی کے دوران قیام ہم لوگوں کو کبھی مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس طرح کا مضمون لکھنے کو دیتے تھے کہ اگر تم کو ہندستان کا گورنر جنرل بنا دیا جائے تو تم ملک کا انتظام کس طرح چلاؤ گے۔'' (مجلۃ العلم کراچی بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۰ء بحوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲/ ۱۰۸)

سیاسی حالات میں تبدیلی:

جس وقت مولانا سندھیؒ نے نظارۃ المعارف قائم کی، یہ ۱۹۱۳ء کی ابتدا تھی، سرزمین ہند پر تو انگریزی مظالم تھے ہی اس کے علاوہ عالم اسلام پر بھی برطانوی چیرہ دستیاں بڑھ رہی تھیں، اہل اسلام کی تمناؤں کا مرکز، مسلمانوں کی امیدوں کا منبع، یورپ کا مرد بیمار ترکی انگریز اور اس کے حواریوں کے اکسانے سے بلقان وطرابلس بلغاریہ ومونٹی نگرو کی بھیانک جنگوں سے نبرد آزما تھا، حکومت برطانیہ کی خلافت عثمانیہ سے دشمنی واضح ہو چکی تھی اور پھر ۱۹۱۴ء میں یورپ کی جنگ عظیم میں دولت عثمانیہ کو زبردستی گھسیٹ کر اس عظیم الشان اسلامی سلطنت کے وجود کو چیلنج کر دیا گیا تھا، یہ وہ حالات تھے جن کو دیکھ کر ہر مسلمان کا دل رو رہا تھا، پورے عالم میں ایک سنسنی تھی، حزن وملال کے بادل محبان وطن پر چھائے ہوئے تھے، اور ابھی یہ جذبات اور زخم ہندستانی مسلمانوں کے قلوب سے مندمل نہ ہوئے تھے کہ کانپور میں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کی غرض سے ایک مسجد کو شہید کر دیا گیا جس سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے، یہ حالات اس بوریہ نشین ہند کے عظیم ترین انقلابی قائد حضرت شیخ الہندؒ پر بھی اپنا اثر کیے

بغیر نہ رہ سکے جو بقول مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ دیکھنے میں منحنی اور لاغر ونحیف تھے مگر سینہ میں صبر واستقامت کا ایک کوہ گراں رکھتے تھے، بظاہر اپنے گوشہ عزلت میں سب سے الگ تھے لیکن ان کی نظر جہاں بیں میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل ونہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہوگئی تھیں، عمر کے لحاظ سے بھی شباب کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے لیکن بایں ہمہ اس کے درد وگداز اور جذب وسوز کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی خلوتوں میں اور جلوتوں میں، رات کی تاریکیوں میں اور دن کے اُجالے میں کبھی جنگ بلقان وطرابلس کے واقعات پڑھ کر آنسو بہاتے تھے اور کبھی اپنے ملک کی زبوں حالی ودرماندگی پر نوحہ کناں ہوتے تھے۔ (ماہنامہ برہان، ستمبر ۴۸ء مضمون مولانا اکبرآبادیؒ بعنوان ''علمائے ہند کا سیاسی موقف''، الجمعیۃ دارالعلوم نمبر ر۲۲۷)

منصوبہ کیا تھا؟:

ان حالات کے رونما ہونے سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کا یہ منصوبہ تھا کہ تحریک کے نمائندے اپنی اپنی جگہ پر پہنچ کر دینی مدرسوں کے قیام کے لیے جدوجہد کریں اور ساتھ ہی ساتھ جذبات حریت کو بھی ابھارتے رہیں تا آنکہ میدان بالکل ہموار ہوجائے اور ہر طرف سے حمایت کی امید قطعی ہوجائے تو ایک تاریخ میں یکلخت پورے ہندوستان میں بغاوت کردی جائے اور کسی دوسرے ملک کی مدد سے یاغستان آزاد قبائل کی طرف سے ملک پر حملہ کردیا جائے، ظاہر ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک طویل زمانہ کی ضرورت تھی۔ لیکن خدا کا کرنا کہ مندرجہ بالا واقعات سے پورے ملک میں بیداری کی ایک لہر پھیل گئی، دوسرے جنگ عظیم شروع ہوجانے کی وجہ سے انگریز کو کسی بھی طریقہ سے نقصان پہنچانا ضروری ہوگیا لہٰذا تحریک جہاد فوراً شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ (تفصیل کے لیے ''تحریک شیخ الہندؒ'' ۶۵ تا ۶۸ دیکھیں)

یاغستان میں جہاد:

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۴ء میں مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کو حاجی ترنگ زئی کے پاس پشاور روانہ کیا اور ان کو پشاور سے یاغستان ہجرت کرنے کا حکم دیا اور یہ فرمایا کہ اب سکون سے کام کرنے کا وقت نہیں ہے بلکہ میدان عمل میں آجانا اور سربکف ہوکر کام شروع کردینا از بس ضروری ہے۔ (نقش حیات ۲/۲۱۰)

چنانچہ یاغستان کے موضع زیگی میں ریاست میں تحریک کا مرکز قائم کیا گیا اور حاجی ترنگ زئیؒ اور مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کی قیادت میں انگریز کے خلاف جہاد کا سلسلہ شروع ہوا، ابتدا میں مجاہدین نے برطانوی فوج کی پلٹنیں کی پلٹنیں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیں اور دشمن کو زبردست نقصان پہنچایا لیکن بعد میں اسلحہ اور رسد کی کمی کے باعث اس سلسلہ کو بند کرنا پڑا اور حضرت شیخ الہندؒ کو یہ اطلاع پہنچائی کہ بغیر کسی حکومت کی پشت پناہی کے سلسلہ جہاد جاری رکھنا دشوار ہے۔ (نقش حیات ۲/۲۱۲)

اگرچہ حضرت شیخ الہندؒ حتی الوسع مالی امداد کا خیال رکھتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ایک عظیم حکومت سے ٹکر لینا آسان کام نہ تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفر حجاز اور مولانا سندھی کا سفر کابل:

بیرونی حکومتوں سے امداد حاصل کرنے کی غرض سے حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے سرگرم شاگرد حضرت مولانا سندھیؒ کو کابل بھیجنے کا اردہ کیا تاکہ وہ حکومت افغانستان کو انگریز کے خلاف نبرد آزما ہونے پر آمادہ کریں اور خود حجاز مقدس جانے کا اردہ فرمایا تاکہ دولت عثمانیہ سے تحریک کے سلسہ میں مدد لی جاسکے، آپ نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو دہلی سے طلب فرمایا اور بغیر کوئی مفصل پروگرام بتائے ہوئے کابل جانے کا حکم دیا، حضرت مولانا عبیداللہ صاحبؒ کابل جانے کا واقعہ اپنی ذاتی ڈائری میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا، مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی، لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا، خدا نے اپنے فضل وکرم سے نکلنے کا راستہ صاف کردیا اور افغانستان پہنچ گیا۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں، ''کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں موجود ہے، ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت تھی، اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے انتخاب پر فخر ہونے لگا۔ (ذاتی ڈائری/۲۳)

الغرض مولانا عبیداللہ سندھیؒ کئی مہینہ مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے خفیہ طریقہ سے ۱۵ر اگست ۱۹۱۵ء یعنی آزادیٔ ہند سے ٹھیک ۳۲ رسال پہلے افغانستان کی سرحد میں داخل ہوکر قندھار ہوتے ہوئے کابل پہنچے جہاں تحریک کے خفیہ ممبران آپ کی آمد کے شدت سے منتظر تھے۔ اور وہاں پہنچ کر آپ سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے، ادھر حضرت

شیخ الہندؒ کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر حکومت ہند آپ کو گرفتار کرنے کی مکمل ارادہ کرچکی تھی، جس کی اطلاع ڈاکٹر انصاری نے حضرت شیخ الہند کو دے دی تھی، اس لیے حضرت شیخ الہندؒ پہلی فرصت میں برطانوی قلمرو سے نکل جانا چاہتے تھے، اتفاق سے حج کا زمانہ قریب تھا، موقع کو مناسب سمجھ کر حضرت شیخ الہندؒ نے حج کے بہانے سے سفر حجاز کا قصد فرمایا ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ نے خود ہی جملہ مصارف ادا کردیے اور حضرت شیخ الہندؒ اپنے جاں نثار خادموں مولانا عزیر گل صاحب مدظلہٗ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ وغیرہ کے ساتھ حجاز مقدس کے لیے روانہ ہوگئے اور ۹/اکتوبر ۱۹۱۵ء میں آپ بخیر وعافیت مکہ معظّمہ پہنچ گئے، دوران سفر حکومت نے آپ کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی لیکن آپ آگے آگے رہے اور گرفتاری کا وارنٹ پیچھے پیچھے۔ (اسیران مالٹا ۳۸)

تحریک کے اہم مراکز:

قبل اس کے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی خدمات اور حجاز میں حضرت شیخ الہند کی سرگرمیوں کو ذکر کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ کے اہم مراکز پر بھی مختصر روشنی ڈالی جائے تاکہ تحریک کی ہمہ گیری اور تنظیم کا پتہ چل سکے، جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے تحریک کے مندرجۂ ذیل اہم ترین مراکز تھے۔ (۱) دیوبند (۲) دہلی (۳) دین پور شریف (۴) امروٹ شریف (۵) کھڈہ کراچی (۶) چکوال (۷) زیگی یاغستان۔

دیوبند:

دیوبند کے مرکز کو حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز روانہ ہونے سے قبل تک اس عظیم ترین انقلابی تحریک کے ہیڈ کوارٹر ہونے کا شرف حاصل رہا، یہاں بقول حضرت شیخ الاسلام حضرت شیخ الہندؒ نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا جس میں ملک وبیرون ملک سے آئے ہوئے انقلابی لیڈر اور تحریک کے خفیہ کارکن جن میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان آکر ٹھہرتے تھے، اور حضرت شیخ الہندؒ رات کی اندھیریوں میں ان لوگوں سے ملاقات کرتے اور ہدایات دیتے تھے حضرت اکثر بڑے بڑے لیڈروں کو تحریک میں شامل کرنے کے لیے ان کو دیوبند طلب فرماتے تھے، چنانچہ تحریک کے ایک وفادار اور جانباز سپاہی جناب خان عبدالغفار صاحب کا بیان ہے کہ: ''دیوبند کے افغان طلبہ کی وساطت سے سرحد میں شیخ الہندؒ کو میری سرگرمیوں کا علم ہوا چنانچہ انھوں نے مجھے دیوبند طلب کیا اور اپنی تحریک میں شامل کرلیا۔''

خان صاحب کا یہ بھی بیان ہے کہ، جب میں دیوبند جاتا تو حضرت شیخ الہندؒ مجھے اپنے مکان میں خفیہ رکھتے، بسااوقات وہ دیوبند سے باہر ایک غیر معروف مقام پر مجھ سے مل کر مجھے جو ہدایات واحکام دینے ہوتے عطا فرماتے۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۶/جنوری ۵۸ء)

دھلی:

اس مرکز کے قائد اور صدر بقول حضرت شیخ الاسلامؒ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے جو حضرت شیخ الہندؒ سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے، جب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کی تو اس کی مرکزیت میں اور اضافہ ہوگیا تھا، اس شہر کو جو سیاسیات ہند کا بھی مرکز عظمیٰ تھا یہ سعادت برابر حاصل رہی تاآنکہ تحریک کے راز فاش ہونے کے بعد نظارۃ المعارف کے نائب ناظم مولانا احمد علی لاہوریؒ گرفتار کرلیے گئے۔ (تفصیل دیکھئے نقش حیات ۲/۲۰۱)

دین پور (سندھ):

پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ یہ شہر اصل میں قادری راشدی بزرگان کی چلائی ہوئی خفیہ تحریک آزادی کا مرکز تھا، جس کی قیادت سندھ کے مقبول ترین ولی کامل خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ فرمارہے تھے اور بعد میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی انتھک جدوجہد سے یہ تحریک ''تحریک شیخ الہندؒ'' کے ساتھ مربوط ہوگئی تھی، چنانچہ اس ربط کے قائم ہونے کے بعد دین پور سرحدی علاقوں میں تحریک شیخ الہندؒ کا مرکز قرار پایا، اس مرکز کے ذریعہ جہاں لوگوں کی ذہن سازی کا کام لیا جاتا تھا وہیں جہاد کے لیے اسلحہ بارود وغیرہ بھی جمع کیا جاتا تھا، اس مرکز کے قائد حضرت دین پوریؒ کی خانقاہ کے صدر دروازے کے نیچے تہ خانہ میں گولہ بارود بنانے کی ایک فیکٹری تھی جس میں خانقاہ کے فقراء تندہی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ (دیکھئے ''ید بیضا'' ۱۲۰ مصنفہ حاجی عبیدی)

دیوبند اور دین پور میں قوی رابطہ تھا، آپس کے ربط اور تبادلۂ اخبار کے حیرت انگیز نظام کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جب دیوبند سے کابل کے لیے روانہ ہوئے اور دین پور پہنچے تو فوراً حضرت دین پوریؒ نے دریافت فرمایا ارے تم کابل نہیں گئے؟ (ید بیضا ۱۲۱) گویا ان کو مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی آمد سے پہلے ہی پورے پروگرام کا علم ہوچکا تھا۔

امروٹ شریف:

یہاں حضرت دین پوریؒ کے پیر بھائی اور تحریک شیخ الہندؒ کے ایک

جانباز خادم حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ اقامت پذیر تھے اور آس پاس کے علاقوں میں بھی آزادی کی روح پھونکنے کا کام انجام دیتے تھے، جہادِ آزادی کے لیے یہاں بھی زبردست تیاری تھی، اس مرکز کا بھی دیوبند کے مرکز سے قریبی تعلق تھا اور برابر ہدایات موصول ہوتی رہتی تھی۔

کھڈہ (کراچی):

یہ مرکز ایک مدرسہ کی شکل میں موجود تھا جس کی قیادت مولانا محمد صادق صاحب کراچویؒ فرماتے تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور تحریک آزادی کے زبرست حامیوں میں سے تھے۔ (تاریخ دارالعلوم ۸۷، جلد دوم سید محبوب رضوی) اس مرکز کے نمائندوں کی خدمات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جب انگریز عراق پر حملہ کرنا چاہتا تھا تو مولانا محمد صادقؒ اور ان کے رفقاء نے ''لس بیلا'' کے مقام پر بلوچی قبائل میں بغاوت کرادی جس کے نتیجہ میں نئی کمک نہ پہنچنے کی بنا پر عراق میں انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا، حضرت شیخ الاسلامؒ نقش حیات میں لکھتے ہیں کہ ''اس بغاوت کی وجہ سے عراق میں جو انگریزی فوج محصور ہوئی تھی ابتداً اس کی تعداد تیس ہزار تھی اور جب حصار ٹوٹا ہے تو کل تیرہ ہزار افراد باقی بچے تھے''۔ گویا یہ بغاوت سترہ ہزار انگریزوں کی ہلاکت کا ذریعہ بنی۔ اس بغاوت کے جرم میں حکومت ہند نے مولانا محمد صادق کراچویؒ کو گرفتار کرلیا تھا۔ (نقش حیات ۲/ ۱۹۷)

چکوال (جہلم):

اس مرکز کے منتظم مولانا ابو محمد احمد چکوالیؒ تھے، جن کو جمعیۃ الانصار کے بانی ممبر ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔ (بحوالہ نقش حیات ۲/ ۱۴۴)

یاغستان کے آزاد علاقے میں سرمایہ پہنچانے کا کام مولانا ابو محمد احمد چکوالیؒ اور مولانا حمداللہ پانی پتیؒ انجام دیتے تھے۔ (دیکھئے تحریک شیخ الہند آخری حصہ ۸)

زیگی (باجوڑ، یاغستان):

یہ مرکز جہاد ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران قائم کیا گیا جب حضرت شیخ الہندؒ نے حاجی ترنگ زئیؒ اور مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کو جہاد شروع کرنے کے لیے یاغستان بھیجا تھا، یہاں جناب خان عبد الغفار خاں صاحب کا یہ بیان دستاویزی حیثیت رکھتا ہے:

''حضرت شیخ الہندؒ آزاد قبائل یاغستان میں ہمارے ذریعہ سے ایک مرکز قائم کرنا چاہتے تھے، جس میں وہ خود بھی آکر شامل ہونا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے میں نے اور مولانا فضل محمودؒ نے آزاد قبائلی ریاستوں میں مرکز کے لیے موزوں مقام تلاش کرنے کے لیے انتہائی مشقتیں اٹھائیں، انگریز کی نگرانی کافی سخت تھی اس کے باوجود ایک مرکز ''زیگی'' ریاست باجوڑ میں قائم کرنے کی کامیابی ہوئی۔'' (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۶؍جنوری ۸۵ء)

حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے ۱۹۱۴ء میں اسی مرکز سے حاجی ترنگ زئی صاحبؒ کے زیر قیادت تحریک جہاد شروع ہوئی جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، لیکن انگریزی ڈپلومیسیوں اور رسد کی کمی کے باعث جب جہاد کا سلسلہ بند ہوا تو حاجی صاحبؒ ریاست مہمند میں مقیم ہوگئے تھے، اور حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب وغیرہ کابل روانہ ہوگئے۔ (نقش حیات ۲/ ۱۸۸)

ان مراکز مشہورہ کے علاوہ حضرت شیخ الہند کے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد اس کو بھی مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی تھی، وہاں اگرچہ پہلے سے حضرت شیخ الہندؒ کے محبوب شاگرد حضرت شیخ الاسلامؒ اقامت گزیں تھے مگر اس وقت تک ان کو سیاسیات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے نقش حیات ۲/ ۲۱۵)

حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الاسلامؒ نے باقاعدہ سیاست میں قدم رکھا تھا، مدینہ منورہ کے مرکز تحریک ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ''الجنود الربانیہ'' نامی فوج کا ہیڈ کوارٹر مدینہ منورہ کو قرار دیا تھا۔ (تحریک شیخ الہند ۲۷۳)

اس کے علاوہ کابل کو بھی حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے پہنچنے کے بعد تحریک کا ایک اہم مرکز سمجھا جانے لگا تھا، اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے کابل پہنچنے سے پہلے ہی سے وہاں تحریک شیخ الہندؒ کے سرگرم کارکن موجود تھے، اس کی تائید مولانا سندھیؒ کے اس عجیب وغریب حیران کن انکشاف سے ہوتی ہے جس کو فاضل مصنف قاضی عدیل عباسی نے اپنی کتاب ''تحریک خلافت'' میں ذکر کیا ہے کہ: ''مولانا منظور نعمانی سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کہا کہ جب وہ کابل پہنچے تو جو کام انھیں کرنا تھا اس کے بارے میں ایک لفافہ خود امیر حبیب اللہ والی افغانستان نے ان کو دیا۔'' (قاضی عدیل عباسی ۴۷)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کابل میں رہ کر مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ذمہ داریوں کی تفصیل حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پہنچادی تھی، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دیوبند سے روانگی کے وقت حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو کوئی مفصل پروگرام نہ بتلایا تھا۔

علاوہ ازیں اس بات سے بھی کابل میں تحریک شیخ الہند کے اثرات

پائے جانے کو تقویت ملتی ہے کہ افغانستان کے قاضی القضاۃ قاضی عبد الرازق صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت گنگوہیؒ کے علم حدیث کے شاگرد تھے حضرت مولانا عبیداللہؒ جب کابل میں ان سے ملے اور انھیں اطمینان ہوگیا کہ یہی مولانا عبداللہ سندھیؒ ہیں تو قاضی صاحب کو نہایت خوشی ہوئی تھی۔ (دیکھئے دارالعلوم کی تاریخ سیاست، شاہین جمالی ۱۱۹و۱۲۰)

اسلحہ کا کارخانہ:

تحریک شیخ الہند کے انقلابی منصوبہ پر عمل کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر اسلحہ خانے بھی قائم تھے اس سلسلہ میں ہم دین پور کے مرکز کی سرگرمیاں ذکر کرآئے ہیں، جہاں یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے وہیں اپنے اندر ایک حکمت عملی کو چھپائے ہوئے ہے، ملاحظہ کیجئے:

''عصر حاضر کے مشہور مصنف مولانا منظور احمد نعمانیؒ راوی ہیں کہ ان سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بتلایا کہ وہ کراچی میں تھے کہ شیخ الہندؒ کا ایک نامہ ملا جس میں ان کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ایک شخص فلاں دن فلاں وقت تمہارے پاس آئے گا وہ جو کچھ کہے اسے محفوظ کرلینا، اور اس سے کوئی سوال نہ کرنا چنانچہ کراچی کی مسجد میں ایک شخص آیا، اور اس نے میگزین کی تفصیل بتلائی بندوق گولہ بارود وغیرہ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اس کو محفوظ کرلیا، اور جب دیوبند گئے تو حضرت شیخ الہندؒ کو بتلادیا، ان کو کچھ نہ معلوم تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ بعد میں لوگوں کے ذریعہ پتہ چلا کہ مولانا (شیخ الہندؒ) نے میگزین کا کوئی کارخانہ قائم کیا تھا، جہاں اسلحہ وغیرہ رکھے جاتے تھے، جس کا کوئی پتہ آج تک سی آئی ڈی کو نہ لگ سکا، یہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ وہ کارخانہ راجستھان میں تھا'' (تحریک خلافت ۴۷و۴۸)

اس روایت سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ تحریک کا نظام کس قدر رازداری سے چلتا تھا اور کہاں تک اس کی جڑیں پھیلی ہوئی تھیں۔

تحریک کا دائرۂ کار:

تحریک شیخ الہندؒ سے متعلق چند اور باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے، چنانچہ جناب عبداللطیف کرت پوری جو بقول خود ایک عرصۂ دراز تک حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں رہے تھے، (تحریک خلافت ۴۵) بیان کرتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ایک جماعت مخلصین کے نام سے بنائی تھی، جس کے بہت ہی چنے ہوئے ارکان تھے وہ کسی کو سفارشی خط لکھیں تو سب کچھ لکھ دیں گے مگر مخلص کا لفظ نہیں لکھیں گے، یہ لفظ صرف جماعت کے نہایت اہم ارکان کے لیے مخصوص تھا۔ اگر وہ کسی کو لکھ دیں کہ یہ بہت مخلص ہیں ان کو دس ہزار روپیہ دے دو تو وہ مکان اثاث البیت غرضیکہ ہر چیز بیچ کر دس ہزار روپیہ ادا کردے گا۔ (قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت ۴۵) جناب عبداللطیف صاحب حضرت شیخ الہندؒ کی اسکیم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت مولانا کی اسکیم یہ معلوم ہوتی تھی کہ سرحد کے قبائلیوں میں جہاد کی روح پھونکی جائے اور اس طرح مجاہدین کی ایک زبردست فوج تیار کی جائے، چنانچہ چند علماء وہاں بھیجے گئے جو قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے اور قرآن پاک کی شرح میں جو جہاد کی تعلیم ہے، اور جس سے ایک زمانہ سے علما صرف گذر جاتے ہیں اس پر سب سے زیادہ زور دینا طے تھا، انجام یہ ہوا کہ قبائلیوں میں زبردست جوش جہاد بھر گیا، اور وہ انگریزوں کے سخت مخالف ہوگئے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک قبائلی اپنے پانچ سال کے بچے کو پستول کھیلنے کے لیے دے دیتا تھا اور کام سے لوٹ کر آتا تو پوچھتا تھا کہ اے میرے بچے: آج تو نے کتنے انگریز مارے؟ وہاں اسلحہ خانہ بھی قائم ہوگیا تھا، رائفلیں اور پستول وہ لوگ خود بناتے تھے۔ (تحریک خلافت ۴۵)

بیرون ہند تحریک کے اثرات:

جناب عبداللطیف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے شیخ الاسلام ترکی کے مفتی اعظم، شیخ الجامعۃ جامعہ ازہر اور علماء و مفتیان مصر حضرت شیخ الہندؒ کے ہم نوا تھے۔ (حوالہ مذکورہ ۴۵)

ایران میں مخلصین کا کارنامہ:

شیخ الہندؒ کی قائم کردہ جماعت مخلصین کے افراد ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند میں بھی اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھے، اس سلسلہ میں عبداللطیف کرت پوری کا بیان کردہ مندرجہ ذیل واقعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: ''جس زمانہ میں شاہ ایران نے اپنے ملک میں تمبا کو کی واحد ٹھیکہ داری انگریز کو دے دی تھی تو وہاں کے مجتہد العصر قابو میں نہ آتے تھے، چنانچہ جماعت مخلصین نے مزدور بن کر جہاز سے سامان اتارنے کا کام شروع کیا اور انگریز نگراں جب شراب پی کر بد مست ہوگئے تو ایک صندوق لے جا کر مجتہد العصر کو دکھلایا اس میں تمباکو کے بجائے آلات حرب بند تھے، تب مجتہد العصر نے فتوی دیا کہ ''تمباکو نوشیدن دریں زمانہ حرام است'' رات کو جب بادشاہ حرم سرا میں گیا تو خلاف معمول اسے حقہ تیار نہیں ملا، آواز دی تو کوئی نہیں بولا، بادشاہ کو غصہ آیا اور وہ زور سے چلائے۔ ''من آواز می دہم وکس نمی شنود، ایں چہ

ماجرا است؟''۔ تو بیگم صاحبہ تشریف لائیں اور کہا کہ آج آپ کو حقہ نہیں ملے گا اور مجتہد العصر کا فتویٰ دکھلایا تو بادشاہ نے فوراً دربار کیا اور مجتہد العصر کو بلا کر کہا کہ حضرت یہ فتوی کیسا ہے؟ اسلام تو ایک عالم گیر مذہب قیامت تک کے لیے ہے، یہ کیا کہ تمبا کو پینا اس زمانہ میں حرام اور دوسرے میں حلال، ایران میں حرام اور ترکستان میں حلال، تو مجتہد العصر نے بادشاہ سے تنہائی کی درخواست کی اور پورا واقعہ بتلایا، اس طرح سے ایران میں انگریزوں کی تمبا کو پر سے اجارہ داری ختم ہوئی۔ (تحریک خلافت ۴۶)

تحریک کے مذکورہ بالا انکشافات اگر چہ عام مؤرخین ذکر نہیں کرتے لیکن تحریک شیخ الہندؒ جیسی عظیم انقلابی تحریک کو دیکھتے ہوئے یہ باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں، اور اس طرح کے نہ جانے کتنے مراکز اور نہ معلوم کتنے واقعات ہوں گے جو آج انہی متعلقہ افراد کے ساتھ اس دنیا سے پردہ کر چکے ہیں۔ بہر حال تاریخ کے ان دھندلے نقوش سے تحریک کے بارے میں جو عظیم تصور قائم ہوتا ہے اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے مراکز میں رابطہ کا ایک خفیہ اور زبر دست نظام تھا جو ہمیشہ متحرک رہتا تھا۔

بزرگوں کی کرامت:

تحریک شیخ الہندؒ کے ان مراکز کا آپس میں ربط اور احکامات کی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت راز داری کے ساتھ منتقلی، اور وہ بھی ایسے نازک دور میں جب سگانِ فرنگ جگہ جگہ سازشوں کی بو سونگھتے پھرتے تھے، ہندستان کے گوشہ گوشہ اور قریہ قریہ میں سی آئی ڈی کے سفید پوش افراد متعین تھے، کسی اور کے نزدیک راز کے فاش نہ ہونے کی چاہے جو وجوہات ہوں راقم الحروف اس کو ان بزرگوں اور عارفین عظام کی کرامت سمجھتا ہے، جن کے اخلاص کو دیکھ کر فرشتے بھی رشک کرتے تھے، جن کے جذبۂ ایمان کا مشاہدہ کر کے قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جو تحریک آزادی میں جاہ و منصب، عزت و شرافت کے لیے نہیں بلکہ شرعی فرض سمجھ کر شریک ہوئے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے پیغامات کو تحریک کے دوسرے مراکز تک پہنچانے میں حضرت مولانا عزیز گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز روانہ ہونے سے قبل آپ کو حاجی ترنگ زئی صاحبؒ کے پاس بھیجا تھا اور ان کی واپسی تک سفر کو موقوف رکھا تھا۔ (دیکھئے ''تحریک شیخ الہند'' آخری حصہ ۳۲)

اس کے علاوہ خان عبد الغفار خان مرحوم کا بھی بیان ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ حاجی ترنگ زئیؒ سے خط و کتابت کا کام انہی خان عبد الغفار صاحب کی وساطت سے انجام دیتے تھے۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۵۸ء)

ایک عجیب طریقہ:

علاوہ ازیں بعض لوگوں نے ان مراکز کے درمیان سفارت کا ایک عجیب و غریب طریقہ ذکر کیا ہے جس سے قطع نظر کر لینا بھی کلیۃً مناسب نہیں، چنانچہ پاکستان کے ایک پروفیسر جناب محبوب الرحمٰن صاحب نے دار العلوم کے عنوان پر اپنے ایک مضمون میں جو ماہنامہ بینات کراچی میں جولائی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ:

''ایک شخص پشاور سے حضرت شیخ الہندؒ کے پاس حاضر ہوتا وہ کاغذ کے پھول اور گلدان بنانا جانتا تھا حضرت اسے کابل کے لیے خط دیتے وہ اسے پھول کی شکل میں بدلتا اور دیگر پھولوں کے ہمراہ گلدان کی صورت میں پشاور لے جاتا کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ کسی پھول میں خط بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ شخص باقی پھول تو مقامی طور پر فروخت کر دیتا لیکن اصل پھول کسی کابل والے کے ہاتھ تھما دیتا جو اس غرض سے پشاور میں موجود تھا'' (پروفیسر محبوب الرحمٰن مظفر آبادی بینات کراچی بابت جولائی ۸۰ء، ص ۴۴۔ مذکورہ بالا واقعہ کی تائید فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے بھی مقالہ پڑھنے کے دوران فرمائی اور بتلایا کہ انہوں نے بذات خود گلدان بنانے والے معمر شخص سے ملاقات کی ہے، محمد سلمان)

اس طرح کے واقعہ کا ثبوت اگر چہ تاریخ جنگ آزادی کی عام کتابوں میں نہیں ملتا، لیکن تحریک شیخ الہندؒ جیسی تحریکات کے لیے بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔

تحریک کے مراکز میں تعلق کے سلسلے میں ایک اور واقعہ اس جگہ قابلِ ذکر ہے، سندھ میں تحریک شیخ الہندؒ کے سب سے اہم مرکز دین پور کے قائد حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ کے صاحب زادہ مولانا عبد الہادی صاحبؒ اپنے بچپن کا واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز کے بعد حضرت دین پوریؒ کے پاس ایک سرخ و سپید نوجوان مسجد میں آیا اور باادب ہو کر حضرتؒ سے مصافحہ کیا حضرت فوراً کھڑے ہو گئے (غالباً حضرت نے تحریک کا نشان یا اشارہ پا لیا تھا) اور اس شخص کو اپنے ساتھ لے گئے، جماعت کے فقراء کیوں کہ حضرت کے مزاج شناس تھے اس لیے کوئی فقیر اس طرف نہیں گیا لیکن چوں کہ میں (راوی) بچہ تھا اس لیے قریب

جا کر دل چسپی سے یہ کارروائی دیکھتا رہا، اس نو وارد نے اپنی مشہدی اتاری اور اپنی زریں کلاہ کو ادھیڑ ڈالا، اس میں سے زرد رنگ کا ایک ریشمی رومال برآمد ہوا جسے اس نے حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔'' (ایضاً ۱۳۴و۱۳۵)

یہ تھی تحریک کے مراکز اور ان کے درمیان رابطہ کی ہلکی جھلک۔ اب ہم مقصد کی طرف لوٹتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کابل میں:

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل روانہ ہونے کا حکم دیا تھا، چناں چہ آپ نے وہاں پہنچ کر تحریک کے لیے انتھک جدوجہد شروع کر دی، اگر چہ قدم قدم پر مصائب سد راہ ہوئیں، اپنوں اور غیروں نے دھوکہ دیا، لیکن آپ صبر کے پتلے بنے رہے اور کبھی بھی مایوسی کو پاس نہ آنے دیا۔ کابل میں رہ کر آپ کی اہم خدمات کو ''نقش حیات'' سے ملخصاً نقل کیا جاتا ہے۔

(الف) آپ نے ترک جرمن مشن کو ہندوستان کی آزادی اور مستقبل کی صحیح پوزیشن سمجھائی اور اپنی بات کو منوایا۔

(ب) عارضی حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاب سنگھ کو صحیح راستہ بتلایا، ان کو متفق کیا اور غلط راہ سے ہٹنے پر مجبور کیا۔

(ج) آپ نے اپنا قوی اثر ارکین دولتِ افغانیہ میں پیدا کیا، اگر چہ امیر افغانستان سردار حبیب اللہ کو جنگ آزادی پر عملی طور سے آمادہ نہ کر سکے اور انگریز کی ڈپلومیسی سد راہ بنی تاہم امیر صاحب مرحوم نے آپ سے بہت تاثر حاصل کیا اور آپ کے لیے مفید مشورے دیئے جن میں ہندو مسلم اتحاد بھی ہے۔

(د) آپ نے عمومی طور پر ارکین دولت افغانیہ کو اپنا ہم خیال بنالیا جس کا کھلا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوا کہ روسی مشن کی واپسی کے بعد جب امیر صاحب نے جرگہ بلا کر انگریزوں سے جنگ کی رائے لی تو تمام ممبرانِ جرگہ انہیں کے ہم خیال وہم زبان تھے۔

(ہ) انہوں نے آئندہ آنے والے امیر امان اللہ خان کو اس قدر متأثر کیا کہ وہ اقتدار پا جانے کے بعد بالکل آپ کا ہم خیال ہو گیا، اور انہوں نے دولتِ افغانیہ کے استقلال کامل کا اعلان کر دیا اور جب افغان برطانیہ جنگ ہوئی تو آپ نے تدابیر جنگ میں پورا حصہ لیا، اور اپنی جنود اللہ کے تربیت یافتہ افراد کو بھی جنگ میں شرکت کا حکم دیا تا آنکہ برطانیہ کو شکست ہوئی، اس پر برطانیہ کے سفیر متعینہ کابل نے کہا تھا کہ ''یہ افغانستان کی نہیں عبید اللہ کی فتح ہے''۔ (ماخوذ از نقش حیات جلد دوم ۱۷۹و۱۸۰ ملخصاً)

اس کے علاوہ کابل میں رہ کر آپ کا ایک اہم کارنامہ جنود اللہ نامی فوج کی تشکیل تھا، جس کے سپہ سالار حضرت شیخ الہندؒ متعین کیے گئے تھے، اور بہت سے تحریک کے ممبروں کو ان کی سرگرمیوں کے مطابق میجر، جنرل، لیفٹنٹ کرنل وغیرہ کے عہدے دیئے گئے تھے، اس جماعت کا ہیڈ کواٹر ''مدینہ منورہ'' کو قرار دیا گیا تھا، اس کے علاوہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اور بھی گراں قدر خدمات انجام دیں جن کے ذکر کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز میں سرگرمیاں:

دوسری طرف حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لے جا چکے تھے، اور انہوں نے مکہ معظّمہ پہنچتے ہی وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کر کے ہندستان کی صحیح صورت حال سے ان کو مطلع کیا تھا اور آپ نے غالب پاشا مرحوم سے مسلمانان ہند کے نام ایک پیغام بھی حاصل کر لیا تھا جس میں مسلمانان ہند کو ظالم انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی تھی، اس پیغام کو لے کر آپ خود ہی استنبول کے راستے سے یاغستان پہنچانا چاہتے تھے لیکن عراق پر انگریزوں کے حملے کی وجہ سے راستہ مخدوش تھا اس لیے غالب پاشا نے آپ کو براہِ استنبول یاغستان پہنچانے سے معذرت ظاہر کی، اس کے بعد آپ نے ''غالب نامہ'' (غالب نامہ کے لیے ایک مخصوص صندوق تیار کیا گیا تھا، جس کے تختوں کے بیچ میں غالب نامہ رکھ کر مولانا ہادی حسن خانجہانپوری کے سپرد کیا گیا جنہوں نے اس کو ہندستان پہنچانے کی خدمت انجام دی اس کے بعد حاجی احمد مرزا نے تحریروں کے فوٹو لیے اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ نے ان کو سرحد پہنچایا) کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہندستان بھیجنے کا انتظام فرمایا، اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کو یہ خدمت سپرد کی کہ یہ تحریر سرحد اور آزاد قبائل میں بکمالِ احتیاط پہنچا دیں، اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں ترکی کے وزیر جنگ جناب انور پاشا اور شامی محاذ کے سربراہ جمال پاشا سے ملاقات کی اور ان سے بھی مختلف تحریریں اور وثائق حاصل کیے، ان وثائق کو لے کر آپ براہ ''مکران'' افغانستان پہنچنے کا ارادہ رکھتے تھے، چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر دوبارہ مکہ معظّمہ اور وہاں سے طائف تشریف لے گئے تا کہ غالب پاشا سے امداد حاصل کر سکیں، لیکن قدرت کو کچھ اور

ہی منظور تھا کہ اچانک شریف مکہ نے انگریزوں سے ساز باز کر کے ترکوں کے خلاف بغاوت کردی اور حضرت شیخ الہندؒ طائف میں محصور ہو گئے، کافی مشقتوں کے بعد مکہ معظّمہ آنا ہوا۔ (تفصیل دیکھئے نقش حیات ۲/۲۱۴ و ۲۲۵ تا ۲۲)

غالب نامہ آزاد قبائل میں:

ادھر ہندستان کے راستہ سے مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے ذریعہ سرحد اور آزاد قبائل میں غالب پاشا کا پیغام پہنچا جس سے مجاہدین کے جوش میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا اور انھوں نے انگریزی غلامی کے طوق کو اتار پھینکنے کا قصد کر لیا، جناب خان غازی کابلی کی تحقیق کے مطابق مولانا منصور انصاریؒ جن تحریروں کو لے کر کابل پہنچے تھے ان میں ایک تحریر حکومت مؤقتہ اور جنود ربانیہ کے ارکان کے نام حضرت شیخ الہندؒ کی تھی جس میں انھیں حکم دیا گیا تھا کہ ۱۹/فروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ میں مندرجہ ذیل پروگرام پر عمل کریں، یہ حکم ایک زعفرانی رنگ کے ریشمی رومال پر تھا (۱) قلات اور مکران کے قبائل ترکی فوجوں کی قیادت میں کراچی پر حملہ آور ہوں (۲) غزنی اور قندھار کے قبائل ترک فوج کی مدد سے کوئٹہ پر یلغار بول دیں (۳) پشاور کے محاذ پر درہ خیبر کے مہمند اور آفریدی شینواری قبائل حملہ آور ہوں (۴) اوگی کے محاذ پر کوہستانی قبائل کی امداد سے حملہ کیا جائے (۵) اس تاریخ کو ہندستان میں آزادی کا پرچم لہرایا جائے۔ (خدام الدین حضرت لاہوری نمبر ۳۰۲)

اگر خاں صاحب موصوف کی تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی تحریک میں کہاں تک مراحل طے کر چکے تھے اور کامیابی کی منزل ان سے کتنی دور رہ گئی تھی؟ جبھی تو مولانا محمد علی جوہرؒ اپنی مجلسوں میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ ہمارے اذہان وخیالات بھی وہاں تک نہیں پہنچے۔ (نقش حیات ۲/۲۴۴) لیکن حضرت شیخ الہندؒ کچھ اور منصوبے بنا رہے تھے اور تحریک کے بارے میں تقدیر خداوندی کچھ اور ہی چاہتی تھی۔

تحریک کے راز کا افشاء:

چناں چہ صرف ایک کارکن کی چوک سے وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا، اور اس عظیم تحریک کا راز فاش ہو گیا جو دار العلوم کی سرزمین سے انجمن ثمرۃ التربیت کی شکل میں اٹھ کر پورے نصف عالم کو اپنے لپیٹ میں لے چکی تھی، اور جس کے قدم کامرانی کے بس لب بام تک پہنچ چکے تھے۔

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ضروری خیال کیا کہ تحریک کے سلسلے میں کابل میں ہونے والے کام کی تفصیل امیر تحریک حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچنی چاہئے تاکہ مفید مشورے لیے جاسکیں اور آئندہ کا لائحۂ علم طے کریں، چناں چہ اس مقصد کے پیش نظر حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ایک خط حضرت شیخ الہندؒ کے نام ایک ریشمی رومال پر تحریر کیا، جس میں جنود ربانیہ اور حکومت موقتہ کے احوال کی تفصیل درج تھی، ساتھ ہی ایک خط سندھ کے مولانا عبد الرحیم صاحبؒ کو لکھا جس میں خط کو مدینہ منورہ پہنچانے کی ہدایت درج تھی، ایک تیسرا خط مولانا محمد میاں انصاریؒ کا حضرت شیخ الہندؒ کے نام تھا۔ یہ تینوں خطوط جو ریشمی رومال پر لکھے گئے تھے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ۱۰/ جولائی ۱۹۱۶ء میں عبد الحق کو حوالہ کیے کہ وہ ان خطوط کو مولانا عبد الرحیم سندھیؒ کے پاس پہنچا دے، عبد الحق اگر چہ تحریک کا ایک ممبر اور قابل اعتماد شخص تھا لیکن نہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ وہ خطوط اس نے اپنے سابق آقا رب نواز کے حوالہ کر دیئے جو انگریز کا کاسہ لیس تھا، رب نواز کے ساتھ چند دنوں پہلے یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ اس کا لڑکا شاہنواز ملتان سے بھاگ کر کابل میں مجاہدین سے مل گیا تھا، جس کی وجہ سے انگریزی حکام کی نظر میں رب نواز کی شخصیت مشتبہ ہو گئی تھی، بدنامی کے اس داغ کو زائل کرنے کے لیے اس نے یہ شرمناک حرکت کی کہ وہ خطوط عبد الحق سے لے کر ملتان ڈویژن کے کمشنر کو دیدیئے (تاریخ دار العلوم ۲/۲۰۱) بعد ازاں ان خطوط پر جب سی آئی ڈی مطلع ہوئی تو اس عجیب وغریب انکشاف سے قصر بکنگھم تک دہل گیا، پورے حکومت برطانیہ کے قلمرو میں زلزلہ آ گیا، حکام ششدر رہ گئے، برٹش انٹیلیجنس کے کارندے اپنی ناکامی پر حیران رہ گئے، اور جب ان ظالموں کو کچھ ہوش آیا تو ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ تحریک کے نمائندوں کو گرفتار کر کے، ان کو سزائیں دے کر اور ان کو تکلیف میں مبتلا کر کے اپنے جذبہ انتقام کو سرد کریں، چنانچہ پورے ہندستان میں جہاں جہاں تحریک کا اثر ہونے کا شبہ تھا چھاپے مارے گئے اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا حتی کہ شریف مکہ کے ذریعہ ترکوں کے خلاف ایک فتویٰ کو بہانہ بنا کر حرم محترم بیت اللہ المعظم سے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے جاں نثار رفقاء حضرت شیخ الاسلامؒ، حضرت مولانا عزیر گل صاحبؒ، حکیم نصرت حسین صاحبؒ اور مولانا وحید احمد صاحبؒ کو گرفتار کرا کر مالٹا کے قید خانوں میں آہنی سلاخوں میں مقید کر دیا، وہاں رہ کر ان صبر کے پیکروں نے قوم وطن کے لیے جو مصائب اٹھائیں